اشاعت کا سینتیسواں سال

اسباق

پونہ (مہاراشٹر)

اپریل تا ستمبر ۲۰۱۷ء

مشترکہ شمارہ

سرپرست

عالی جناب منور پیر بھائی صاحب

قانونی مشیر

ع۔ع۔اشرفی

9422520230

آرائش و کمپیوٹر کمپوزنگ

تنویر مبارکپوری : 07385088012

زر سالانہ	:	200 روپے
لائبریریوں سے		250 روپے
خصوصی تعاون		500 روپے
لائف ممبر شپ		5000 روپے
اس شمارے کی قیمت		60 روپے

مدیر

نذیر فتح پوری

M : 0091 9822516338
M : 0091 8055755623

نائب مدیرہ

شمشاد جلیل شاد

0091-9420864859

پرنٹر، پبلیشر اور پروپرائٹر

نذیر فتح پوری نے جے گنیش پریس پونہ سے
چھپوا کر و مان درشن، لوہ گاؤں روڈ، پونہ ۴۱۱۰۳۲
سے شائع کیا۔

رابطہ

(1) Saira Manzil,230/B/102
Viman darshan Sanjaypark
Lohgaon Road Pune-411032M-S

(2) Nazeer fatehpuri
PostBoxNo.13,YerwadaPune411006

E-mail:
nazir_fatehpuri2000@yahoo.com

نوٹ:

(۱) مضمون نگار کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں
(۲) اسباق سے متعلق کوئی بھی قانونی چارہ جوئی صرف پونہ کی عدالت میں ہوگی۔ (ادارہ)

16+073

شمارہ کار

• گفتِ باہمی......اداریہ.........شمشاد جلیل شاد۔ ۴
• شمیم طارق سے ایک ادبی مکالمہ......روشنی خان۔ ۵
• فیض کے نعتیہ اشعار۔ایک خوشگوار بحث۔شمیم طارق۔ ۱۳

گوشہ۔محمد ادریس رضوی۔صفحہ نمبر ۱۶ تا ۷۳

• افسانہ۔آج رات جھوم لے۔ڈاکٹر فیروز عالم۔ ۷۴
• افسانہ۔لکشمن ریکھا......کلدیپ جوشی۔ ۷۸
• افسانہ۔رہائی...........ایم مبین۔ ۸۳
• افسانہ۔ستالہو..........وحشی سعید۔ ۹۰
• افسانہ۔ستالہو کا تجزیہ......شارق عدیل۔ ۹۳
• نظم......مرا قلم ہے مرا مبلغ۔عامر قدوائی۔ ۹۶
• نظمیں/سائبان۔پروین شیر/تناؤ۔ملکہ نسیم۔ ۹۷
• نظم۔تسلیم احمد تصور کی نذر......احمد رئیس۔ ۹۸
• غزلیں۔اختر شاہجہاں پوری/ڈاکٹر محبوب راہی۔ ۹۹
• دو غزلیں۔نقشبند قمر نقوی بخاری۔.............. ۱۰۰
• دو غزلیں۔عزیز اعظمی مبارکپوری۔ ۱۰۱
• غزلیں۔خان حسنین عاقب/طارق قمر۔ ۱۰۲
• دو غزلیں۔شارق عدیل۔ ۱۰۳
• دو غزلیں۔تبسم رحمانی/مدہوش بلگرامی۔ ۱۰۴
• دو غزلیں۔مظفر احمد مظفر/شاہد پٹھان۔ ۱۰۵
• دو غزلیں......شمشاد جلیل شاد۔ ۱۰۶
• دو غزلیں......عابد قزلباش/اسد برہانپوری۔ ۱۰۷
• دو غزلیں......شعور آشنا/تاج محمد تاج۔ ۱۰۸
• راجستھان کا ایک معتبر شاعر محمد حسن۔
شاہد احمد جمالی.................................۱۰۹
• راجستھان کے مایۂ ناز شاعر مولانا قمر واحدی۔
آمنہ خاتون۔................................. ۱۱۱
• ٹیڑھی لکیر کا تنقیدی جائزہ۔وزارت خان ۔ ۱۱۴
• ڈی ڈی اردو راجستھان کے مشاعرہ پر ایک نظر۔
عبدالمنان................................. ۱۱۷
• تبصرہ۔چھوٹا بچہ، چھوٹی کتاب۔ایم مبین۔ ۱۲۴

مکتوبات ۱۲۵ تا ۱۲۸

شاہ حسین نہری/شارق عدیل/شاہد پٹھان/شبیر فراز فتح پوری/بدر محمدی۔

☆☆☆

سہ ماہی اسباق کی مسلسل اشاعت پر

دلی مبارک باد

M.I.Jaod 9820012485

IFRA

DEVELOPMENT

CORPORATION

اداریہ

گفتِ باہمی

شمشاد جلیل شادؔ

معززمحبانِ اسباق ! سلام مسنون۔

میں شمشاد جلیل شاد اسباق کی نائب مدیرہ کی حیثیت سے پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں، اس حقیقت سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ سہ ماہی اسباق پونہ نے اپنی اشاعتی زندگی کے چھتیس برس مکمل کر لئے اور زیرِ مطالعہ شمارے کے ساتھ ہی اسباق کی زندگی کا سینتیسواں برس شروع ہو چکا ہے۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے، ایک بڑی صداقت ہے آپ اسے قدرت کا کرشمہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب اسباق ۹ رمئی ۱۹۸۱ء میں جاری ہوا تو کسی کے خیال وخواب میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسباق اس طرح تاریخ بنائے گا اور اپنی زندگی کا احساس دلاتا رہے گا۔ پونہ میں ادبی رسائل کی اشاعت کی کوئی روشن تاریخ نہیں ہے آزادی کے بعد صرف اسباق ہی ایک رسالہ ہے جو جاری بھی ہوا اور زندہ بھی رہا، کارواں سے بچھڑ کر نذیر فتح پوری نے نہایت ذمہ داری کے ساتھ اسباق کی اشاعت کا فریضہ انجام دیا اور اُردو کی تمام بستیوں میں اسباق کی ادبی شناخت قائم کرنے میں کامیاب رہے، ساتھ ہی پونہ شہر کا نام بھی روشن کیا۔ اللہ کا شکر ہے آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، گذشتہ تین سال سے اسباق کی نائب مدیرہ کے طور پر ایک ذمہ داری میرے کندھوں پر بھی آئی ہے میں پوری کوشش کروں گی کہ ہر طرح سے اسباق کی معاونت کروں اور ۱۹۸۱ء میں جو چراغ سرزمینِ پونہ سے روشن ہوا اس کی نہ صرف یہ کہ حفاظت کروں بلکہ اس کی روشنی میں اضافے کے لئے بھی کوشش کرتی رہوں۔

آج ہمارے چاروں طرف مہنگائی کا شکنجہ کس دیا گیا ہے تمام اشیاء کے ساتھ ساتھ کاغذ اور طباعت کے نرخ بھی آسمان چھونے لگے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معزز قارئین اور معاونین کی عدم توجہی بھی قابلِ تشویش ہے، بہت سوں نے برسوں سے زرِ سالانہ کی ترسیل کی ذمہ داری بھی پوری نہیں کی ہے۔ ایسی صورت میں اشتہارات کی فراہمی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اسباق کی اشاعت دھیرے دھیرے موخر ہوتی جا رہی ہے مستقبل میں ہم اسباق کی اشاعتوں کو تسلسل عطا کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لئے آپ تمام کے تعاون کی شدید ضرورت ہے۔ برسوں سے اسباق جن حضرات کو اعزازی ارسال کیا جاتا رہا ہے اُن سے بھی گزارش ہے کہ اسباق کے لئے خاطر خواہ مالی تعاون ارسال کریں اور برسوں سے جن حضرات نے زرِ سالانہ کی ترسیل کی جانب توجہ نہیں فرمائی وہ بھی سنجیدگی کے ساتھ اپنی بقایا رقم از خود حساب جوڑ کر ارسال کرنے کی کوشش کریں ! یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اسباق کے لئے نئی زندگی اور نیا جوش عطا کرنے میں ہمیں آپ کے پُر خلوص مشوروں کے ساتھ ساتھ قلمی اور مالی تعاون کا شدت سے انتظار ہے۔

ان شاء اللہ آئندہ بھی آپ سے تخاطب کا شرف حاصل کرتی رہوں گی۔

زرِ سالانہ دوسو روپئے۔(۲۰۰)/خصوصی تعاون۔پانچ سو روپئے۔
لائف ممبر شب۔پانچ ہزار روپئے۔(۵۰۰۰)۔

’’تخلیق اپنی معنویت کھوتی جا رہی ہے اور الفاظ اپنی حرمت، مگر شبِ تاریک میں خطِ روشن کا احساس دلانے والے تخلیق کار بھی موجود ہیں۔‘‘

شمیم طارق سے روشنی خان کی بات چیت

[شمیم طارق کا نام اردو زبان و ادب اور صحافت کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، وہ کسی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ نہیں ہیں۔ وہ معاشیات اور اکاؤنٹس کے طالب علم رہے ہیں۔ مگر اردو زبان و ادب سے والہانہ محبت کے سبب انہوں نے ایک شاعر، صحافی اور نقاد کی حیثیت سے اس کی خدمت کی۔ اردو دنیا نے ان کی خدمات کی خاطر خواہ پذیرائی کی۔ وہ ڈیڑھ درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ وہ کالم نگار بھی ہیں اور گذشتہ ۳۵ برس سے اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ’’انقلاب‘‘ میں ان کا ہفتہ واری کالم تقریباً ربع صدی سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اتنا مقبول ہے کہ قارئین کو اس کا انتظار رہتا ہے۔

شمیم طارق کے علمی ادبی مضامین الگ نوعیت اور معیار کے ہیں۔ موضوعات میں تنوع بھی بہت ہے۔ عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو کے تخلیق کاروں یا تنقید نگاروں میں اتنے متنوع موضوعات پر مضامین کسی نے نہیں لکھے ہیں۔ ادبی تنقید، تحقیق، لسانیات، تصوف، تاریخ، معاشی اور سماجی مسائل پر ان کے مضامین قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

راقم نے موصوف سے جو طویل ادبی مکالمہ کیا اس کے بعض حصے قارئین کی نظر ہیں۔ اس مکالمے کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں ذاتی نوعیت کے کچھ سوالات ہیں، دوسرے میں ادبی تنقید اور تخلیق ادب کی عصری صورت حال کو موضوعِ گفتگو بنایا گیا ہے اور تیسرے حصے میں سرکاری اداروں سے متعلق استفسار ہے۔ (روشنی خان)]

(الف)

روشنی خان : میں ممبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہوں، پڑھاتی ہوں۔ ان دنوں ایک تصور یہ عام ہوگیا ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو شعبے اور اردو تدریس کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔ آپ کیا

سوچتے ہیں؟

شمیم طارق : میں کسی یونیورسٹی کے اردو شعبے سے استاذ یا طالب علم کی حیثیت سے کبھی وابستہ نہیں رہا۔ ہاں، اردو شعبوں میں میرا آنا جانا رہا ہے۔ میں ان کے رابطے میں ہوں۔ اردو کے بعض اساتذہ اور طلبا سے مجھے شکایت بھی ہے۔ اس کے باوجود میں اردو شعبہ کے اساتذہ اور طلبا کو عمومی حیثیت میں موردالزام ٹھہرانے کے خلاف ہوں۔ آج بھی قابل احترام اساتذہ اور قابل رشک طلبا موجود ہیں۔ نام گنانے میں ڈر یہ رہتا ہے کہ جس کا نام غلطی سے چھوٹ جائے گا اس کو تکلیف ہوگی اس لیے نام گنانے سے گریز کر رہا ہوں۔ مگر میری زبان پر کئی ایسے نام ہیں جو اردو پڑھاتے ہیں اور خوب پڑھاتے ہیں۔ ان میں نئے بھی ہیں اور پرانے بھی۔ اسی طرح طلبا کا بھی معاملہ ہے۔ بہت سے ذہین طلبا بھی شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں۔ ہاں، چونکہ کابل میں گدھے بھی ہیں اس لیے اکا دکا ایسے اساتذہ بھی اردو شعبوں سے وابستہ ہیں اور رہے ہیں جو اردو تدریس اور تہذیب کی رسوائی کا سبب بنے ہیں مثلاً ایک بہت معمر استاذ جو ماہر لسانیات ہونے کے مدعی ہیں، اقبال پر اپنے ایک مضمون میں ''فلک نہم'' لکھا ہے۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ ایسے ''الف سے الامہ قسم کے شخص'' کی قلعی کھولنے والے بھی اردو شعبے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

روشنی خان : چونکہ آپ کسی یونیورسٹی سے وابستہ نہیں ہیں اور پھر آپ کے پاس اردو میں ڈگری بھی نہیں ہے اس بنا پر بعض لوگوں نے آپ کی ادب فہمی پر سوال اٹھائے ہیں۔

شمیم طارق : بعض لوگوں نے نہیں صرف دو چار لوگوں نے جنھیں ڈھینچوں کی آواز بہت پسند ہے اس آواز پر رقص کیا ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ اردو میں ڈگری یا یونیورسٹی سے وابستگی کی شرط رکھی جائے گی تو تنقید، تحقیق اور تخلیق سے ہم رشتہ درجنوں مقتدر شخصیات غیر معتبر کہلائیں گے۔ آج کی مثال دیتا ہوں، شافع قدوائی ماس کمیونیکیشن سے وابستہ ہیں، شعبۂ اردو سے وابستہ نہیں ہیں۔ شمس بدایونی کاشتکاری اور تجارت کرتے ہیں۔ کالی داس گپتا رضا ساہوکار تھے۔ ظ انصاری روسی زبان کے استاد تھے۔ کیا ان تمام لوگوں کو ایک شکست خوردہ ذہن کی تسکین کے لیے فراموش کر دیا جائے گا۔ اور پھر سیکڑوں ایسے تخلیق کار بھی گذرے ہیں جن کے پاس کوئی ڈگری ہی نہیں تھی۔ روزگار بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان سب نے زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ بڑے عہدوں پر رہنے والوں نے نہیں کی ہے۔

روشنی خان : بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جتنے تخلیق کار یونیورسٹیوں سے باہر پیدا ہوئے، یونیورسٹیز میں نہیں ہوئے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

شمیم طارق : پیشۂ تدریس سے وابستگی الگ ہے اور تخلیق کار ہونا الگ۔ مگر دونوں کی اہمیت ہے۔ یونیورسٹیوں نے ہمیں علمی کام کرنے والے دیے ہیں مگر شاعر، افسانہ نگار، تخلیق کار

یونیورسٹیوں سے باہر رہ کر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑے افسانہ نگاروں اور شاعروں میں دو چار نام ایسے ہو سکتے ہیں جو یونیورسٹی سے وابستہ تھے یا ہیں مگر بیشتر باہر کی دنیا میں بے چارگی و آوارگی کے باوجود مست رہتے ہیں۔ میر، غالب، منٹو اردو شعبوں اور یونیورسٹی میں نہیں پیدا کیے جا سکتے مگر یونیورسٹیوں اور اردو شعبوں میں کیے جانے والے علمی کاموں سے صرف نظر کر کے انھیں پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا سکتا۔ اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ یونیورسٹیوں میں جو کام ہو رہا ہے وہ بھی اہم ہے اور یونیورسٹیوں کے باہر ہم جیسے لوگ اپنی محرومی و آوارگی کے باوجود جو کر رہے ہیں وہ بھی کم اہم نہیں ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ ہم جیسوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، شمیم حنفی، نثار احمد فاروقی، وارث علوی، حنیف نقوی، وہاب اشرفی، خلیق انجم، ابوالکلام قاسمی، علی احمد فاطمی، خالد محمود، بیگ احساس ...... میں کتنے نام لوں سب نے محبت کا معاملہ کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں ہیں۔ انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ تم چونکہ آئی اے ایس نہیں ہو اس لیے تمھیں لکھنے یا کچھ بولنے کا حق نہیں ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان تمام حضرات نے مجھے ''سند'' دے دی ہے اب مجھے اصلاح کی ضرورت نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ مگر انھوں نے کام کرتے رہنے کی ترغیب ضرور دی ہے۔ ایک شخص اس ذہن و ظرف کا نہیں ہے تو کیا کیا جائے۔ آتش حسد اس کے ہی منہ کو کالا کر رہی ہے۔

روشنی خان : کچھ اور بھی ایسے لوگ ہیں...

شمیم طارق : ہاں، چھینٹا کشی اسی پر ہوتی ہے جو کردار کا صاف ہو۔ ٹانگ اسی کو ماری جاتی ہے جو دوڑنا جانتا ہے۔ میرے ساتھ یہ سب ہوتا رہا ہے مگر میں ایک کونے میں بیٹھا اپنا کام کر رہا ہوں۔ غلاظت کے پروردہ لوگوں سے یہ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کبھی اصلی اور کبھی جعلی نام سے مراسلے لکھ رہے ہیں۔ ان حرکتوں سے وہ ادب میں اپنا نام تو نہیں لکھوا سکتے ہاں کچھ غیر ادبی لوگوں کی تفریح کا سامان ضرور بن سکتے ہیں۔

روشنی خان : اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں آتی ہے آپ کو

شمیم طارق : کیوں نہیں- میں بار بار کہہ رہا ہوں کہ حسد- حسد کے علاوہ دھونس جمانے کی خواہش، سستی شہرت حاصل کرنے کی کوشش، کسی بات کا انتقام لینے کا جنون۔ ایک واقعہ سنیے۔ شولا پور سے ایک صاحب نے کبھی مجھے خط لکھا کہ وہ غالب اور جھنجوٹی راگ کے عنوان سے مضمون لکھنا چاہتے ہیں، میں ان کی مدد کروں۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اسی دوران آج کل میں میرا کوئی مضمون شائع ہوا تھا موصوف نے فوراً میرے خلاف ایک مراسلہ لکھ دیا جو چھپ گیا۔ کچھ لوگوں کا خبث باطن انھیں بدگوئی اور بیہودہ نویسی پر اُکساتا ہے۔ ممبئی میں بھی ایسے شر پسند ہیں۔ نام بدل کر، کبھی دوسروں کو اُکسا کر گالم گلوج لکھ رہے ہیں۔

(ب)

روشنی خان : آپ شاعر، نقاد اور صحافی ہیں۔ ''تقابل اور تناظر''، ''غالب اور ہماری تحریک آزادی''، ''تصوف اور بھکتی۔تنقیدی اور تقابلی مطالعہ''، ''غالب، بہادر شاہ ظفر اور ۱۸۵۷ء''، ''صوفیہ کی شعری بصیرت میں شری کرشن'' جیسی کتابوں کے مصنف ہیں جو تنقید سے بھی ہم رشتہ ہیں اور تحقیق سے بھی۔ آپ تنقید، تحقیق، تخلیق سے بیک وقت کس طرح اپنا رشتہ استوار رکھے ہوئے ہیں؟

شمیم طارق : تنقید، تحقیق اور تخلیق کے دائرے الگ الگ ہیں مگر انھیں ایک دوسرے کی ضد بنا کر نہیں پیش کیا جاسکتا۔ تنقیدی شعور کے بغیر تخلیق بے اعتبار ہوتی ہے۔ تخلیقی شان کے بغیر تنقید کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تحقیق، حق کی بازیافت کا نام ہے جو تیشۂ نظر کے فنکارانہ استعمال اور اچھی زبان کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے اس طرح تنقید، تحقیق اور تخلیق میں ہم رشتگی کا ادراک ہوتا ہے۔ میں بنیادی طور پر ایک فنکار ہوں۔ میں کبھی شاعری کے ذریعہ کبھی شاعری یا تخلیق کے کسی اور مظہر کی پرکھ کے ذریعہ اور کبھی حقیقت کی بازیافت کے ذریعہ اپنے آپ پر منکشف ہوتا رہتا ہوں اور تنقید، تحقیق، تخلیق وجود میں آتی رہتی ہے۔ کسی بھی حیثیت سے میں مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، مگر مختلف حیثیتوں سے ادب میں اپنی موجودگی کا اثبات ضرور کرتا ہوں۔

روشنی خان : یہ اثبات تو ساہتیہ اکیڈمی اور کچھ دوسری اکیڈمیوں نے بھی کیا ہے۔

شمیم طارق : جی ہاں، میں ان تمام اداروں اور اکیڈمیوں کا شکر گذار ہوں۔ عزت افزائی تو ہوئی ہے لیکن یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ بعض اکیڈمیوں نے میرے حق میں فیصلہ کر کے کسی شخص یا لابی کے دباؤ میں اپنا فیصلہ بدل دیا۔ مجھے ایسے لوگوں سے بھی کوئی شکایت نہیں۔ اپنے خلاف چند لوگوں کی صف بندی اور بیہودہ گوئی کے بارے میں بس یہی کہنا چاہتا ہوں کہ صف بندی کسی معذور شخص یا دیوانے کے خلاف تو ہوتی نہیں۔ حاسدوں کا صف بندی کرنا یا بیہودہ مراسلے لکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ مجھ کو اور میری تحریروں کو زندہ سمجھتے ہیں۔ یہ احساس بھی جلد ہی ہو جائے گا کہ بجلی کی کڑک کس طرح فضا کی کثافتوں کو صاف کر دیتی ہے۔ میرا لکھنا جاری ہے اس لیے ان کا صاف ہو جانا بھی یقینی ہے۔

کثافت اور غلاظت کی صفائی کا ایک قدرتی نظام موجود ہے۔ جو کثافت بجلی کی کڑک سے اور جو غلاظت ہوا کی تیزی یا آبِ رواں کی لہروں سے صاف نہیں ہوتی اس پر کتے، سور اور گدھ مسلط کر دیے جاتے ہیں...... وہ چٹ کر جاتے ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ میں ''محسود'' ہوں حاسد نہیں ہوں۔ محسود وہی ہوتا ہے جس کو قدرت کسی نعمت سے سرفراز کرتی ہے۔ میں محسود ہونے کو اکیڈمیوں کے انعام سے بڑا انعام سمجھتا ہوں۔

روشنی خان : کیا آپ اردو کے عصری ادبی منظر نامے سے مطمئن ہیں؟

شمیم طارق : حالی، شبلی سے پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی اور دوسرے فنکاروں تک نے جو زبان لکھی ہے یا لفظ و معنی کے رشتے کا جس طرح پاس کیا ہے وہ وقت کے ساتھ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ موجودہ نسل میں الفاظ کی حرمت کا وہ احساس باقی نہیں ہے جو پیش رو ادیبوں اور فنکاروں میں تھا۔ اسی لیے تخلیق کار اپنا بھرم کھوتے جا رہے ہیں۔ اس موقع پر میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہماری زبان کی ادبی روایت میں اتنی تازگی اور حیات بخش قوت اب بھی ہے کہ حالات اچھے نہ ہونے کے باوجود محقق، تنقید نگار، تخلیق کار، شبِ تاریک میں خطِ روشن کی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔ میری تمام تر امیدیں ان ہی سے وابستہ ہیں۔

روشنی خان : اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں کہ اردو تعلیم کا اب وہ معیار نہیں رہا جو پہلے تھا۔

شمیم طارق : ہاں پری پرائمری، پرائمری، سیکنڈری اور پھر کالج سے یونیورسٹی کی سطح تک اردو تعلیم کے معیار میں فرق آیا ہے دوسرے وہ تہذیب بھی ختم ہوتی جا رہی ہے جو لفظوں کو بولنے اور برتنے کا سلیقہ ان کو بھی سکھا دیتی تھی جو ناخواندہ ہوا کرتے تھے۔ ہماری تاریخ میں ایسے شاعروں کی پوری روایت موجود رہی ہے مگر آج؟ بعض اردو تحریروں پر تو ''ٹیلیگرافک اردو'' ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ بعض بہت خوبصورت لفظوں کے تلفظ اور محل استعمال پر دھاوا بولا جا رہا ہے۔ یہاں یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ تخلیقی عمل میں کسی لفظ کو معنوی توسیع سے ہمکنار کرنے اور لفظ کی صورت یا سیرت میں بگاڑ پیدا کرنے میں بنیادی فرق ہے۔ اس فرق کو سمجھنے والے اس وقت کم ہوتے جا رہے ہیں۔

روشنی خان : ہم عصر ادبی شخصیات کے ساتھ آپ کے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟

شمیم طارق : محبت، اعتراف اور اخلاص کا معاملہ رہا ہے۔ جو عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے ان میں ظ انصاری، حسن نعیم، کالی داس گپتا رضا سے ان کی زندگی میں جو تعلقات تھے سو تھے ان کے انتقال کے بعد بھی میں مسلسل ان پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں۔ ساہتیہ اکادمی نے گپتا رضا پر میری کتاب شائع کی ہے۔ ظ شناسی این سی پی یو ایل نے شائع کی ہے۔ حسن نعیم پر مونوگراف بھی یہیں سے شائع ہو رہا ہے۔ ان شخصیتوں پر میں نے پروگرام بھی کیے ہیں۔ یعنی بزرگ ادیبوں کے کاموں کا اعتراف کرنے میں، میں نے کبھی غفلت نہیں برتی۔ جاں نثار اختر، ظفر گورکھپوری اور سید امین اشرف کی شاعری پر میرے مضامین ہیں۔ جو عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، ان سے میں بہت محبت کرتا ہوں مگر ان نوجوان ادیبوں اور شاعروں پر مضمون لکھنے کا وقت ابھی نہیں آیا مگر میں ان کا ذکر محبت سے کرتا رہا ہوں۔ تقریروں میں بھی ان کا نام لیتا رہا ہوں۔

ایسے نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں کئی ایسے نام بھی شامل ہیں جو میرا ذکر اچھے لفظوں میں نہیں کرتے مگر مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ میں رد پر قبول کو فوقیت دیتا ہوں۔

روشنی خان : اردو کی ایک مشہور غزل، ''نہ کسی کی آنکھ کا نور......'' کے متعلق آپ کی تحقیق کا خاصا چرچا رہا، اس پر آپ کیا کہیں گے؟

شمیم طارق : ہاں، اس سلسلے میں کسی قسم کے تعصب کا معاملہ نہیں ہے۔ میں پوری ایمانداری کے ساتھ اعتراف کرتا رہا ہوں کہ مضطر خیر آبادی اور سیماب اکبر آبادی بہت اہم اور اچھے شاعر ہیں۔ شعراء کی کئی نسلوں کی انھوں نے آبیاری کی ہے۔ بعض وجوہ سے میری رائے ہے کہ ''نہ کسی کی آنکھ کا نور......'' والی غزل ظفر کی ہے۔ اسی طرح ایک اور غزل کا معاملہ ہے دلیل یہ ہے کہ یہ غزل مصرعوں کی ترتیب، لفظوں کے فرق اور شعروں کی تعداد میں کمی اور زیادتی کے ساتھ ایک عرصہ سے مشہور رہے۔ اس سے سیماب یا مضطر کی عظمت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ بعض چھوٹے لوگوں نے اس سلسلے میں لگائی بجھائی کا معاملہ کیا۔ مگر اچھی نیت سے لکھی گئی بات دل پر اثر کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص میری بات تسلیم کر لے مگر واقعہ یہ ہے کہ ادبی دنیا میں میری بات بھی سنی گئی ہے۔ جاوید اختر صاحب بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ وہ مجھ سے بدگمان نہیں ہوئے۔

(ج)

روشنی خان : کیا آپ اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بنائے گئے سرکاری اداروں کی کارکردگی سے مطمئن ہیں؟

شمیم طارق : سرکاری اداروں سے آپ کی مراد شاید ان اداروں سے ہے جو اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بنائے گئے ہیں مثلاً اردو اکادمیاں اور قومی کونسل وغیرہ اور ان شعبوں سے بھی جو کسی خاص زبان سے تعلق نہیں رکھتے، مگر ادب و ثقافت کی ترقی کا کام کرتے ہیں۔ میں کہوں گا نہیں۔ یہاں سے کچھ اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں، مسودوں پر مالی امداد ملی ہے مگر چونکہ اردو والوں نے ہی اردو والوں کا گلا کاٹا ہے، بدسلیقگی کا مظاہرہ کیا ہے اس لیے ان کا وہ فائدہ عام اردو والوں کو نہیں مل سکا ہے جو ملنا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر مہاراشٹر اردو اکیڈمی نے مجھے ''انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری'' کے عنوان سے کتاب لکھنے کا پروجیکٹ دیا۔ میں نے پروجیکٹ مکمل کر کے جمع کر دیا۔ ایگزیکیوٹیو صدر نے بھرے جلسے میں اشاعت کا اعلان بھی کر دیا، پھر اسی نے پرانی تاریخ ڈال کر خط لکھا اور اشاعت میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ میں نے یہ کتاب خود ہی شائع کر دی تو ۱۰۰ کاپیاں خریدنے کا فیصلہ کیا مگر اس پر بھی عمل نہیں کیا۔ ایگزیکیوٹیو چیئرمین کی میعاد ختم ہو گئی۔ یہ معاملہ اقلیتی کمیشن کے پاس بھی جا چکا ہے۔ اس کے چیئرمین نے انصاف دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ انصاف تو کیا دلاتے، میعاد ختم ہونے سے پہلے ہی برطرف کر دیے گئے۔ مگر ان سب کے چیلے چپاٹے اپنا کام کر رہے ہیں۔ سارا معاملہ اردو والوں کے سامنے ہے مگر کوئی بولنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ ڈرتے ہیں کہ اکیڈمی کے خلاف بولیں گے تو مستقبل میں کوئی انعام نہیں ملے گا۔

روشنی خان : ان اداروں کو بافیض بنانے کے لیے کیا تدابیر کی جا سکتی ہیں؟

شمیم طارق : ان اداروں کے سربراہوں کی نامزدگی سیاسی وابستگی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اردو کے کیا مسائل ہیں اور انھیں کیسے حل کیا جا سکتا ہے؟ مودی حکومت میں ایک صاحب قومی کونسل کے وائس چیئرمین بنائے گئے تھے۔ ان کی باتیں سن کر کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ قومی کونسل کو ختم کروانے کا ایجنڈا لے کر آئے ہیں۔ وہ چلے گئے مگر اپنا کام کر گئے نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔

مہاراشٹر کی پچھلی شیوسینا - بی جے پی حکومت میں اردو اکیڈمی کے جو صاحب ممبر سکریٹری بنائے گئے تھے وہ مجروح سلطانپوری کو سلطان مجروح پوری کہا کرتے تھے، آپ ان سے کیا امید کر سکتے ہیں۔ کچھ اردو کے لوگ بھی ان اداروں میں ذمہ دار بنائے گئے مگر انھوں نے اپنی ذات اور اپنے گروپ کو دیکھا - رہی سہی کسر اسٹاف نے پوری کر دی۔

روشنی خان : حکومت کے شعبوں میں......؟

شمیم طارق : اردو سے ان کا تعلق برائے نام ہے۔ ''منسٹری آف کلچر'' کا میں سنیئر فیلو رہ چکا ہوں۔ وقت پر سارا کام ایمانداری سے ہوا۔ اگر دوسرے شعبے اردو کے فروغ کے لیے وہ کارکردگی نہیں انجام دے رہے ہیں جس سے اردو کا فائدہ ہو تو اس لیے کہ ان سے رابطہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ ہمارے یہاں ضابطے کے مطابق کام کرنے والوں کی بھی کمی ہے۔ اس سے بھی نقصان ہو رہا ہے۔

روشنی خان : ہم اردو والے کیا کر سکتے ہیں؟

شمیم طارق : دو ہی کام ہیں۔ ہم دیکھیں کہ سرکاری ادارے اور شعبے کیا کر سکتے ہیں مگر نہیں کر رہے ہیں اور خود ہم غیر سرکاری سطح پر اردو ادب کے فروغ کے لیے کیا کر سکتے ہیں، اور بس۔

روشنی خان : کیا اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مسلم اداروں اور ادبی تہذیبی انجمنوں کی سرگرمیاں اطمینان بخش ہیں؟

شمیم طارق : جو مسلم ادارے ہیں یا تہذیبی انجمنیں اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہی ہیں ان کی ستائش ضروری ہے مگر خوش فہمیوں میں مبتلا رہنا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو کام ہونے چاہئیں وہ نہیں کیے جا رہے ہیں۔ مہاراشٹر کی مثال سامنے رکھیں تو انجمن اسلام کی کریمی لائبریری میں ادبی علمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ عابدہ انعامدار صاحبہ اعظم کیمپس میں اور دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے ذریعہ بھی اچھے پروگرام کر رہی ہیں۔ بھیونڈی میں ادبی کارواں نے اور ''یاران ادب'' وغیرہ نے چند اچھے پروگرام کیے ہیں۔ اردو تعلیم کے سلسلے میں 'کاوش' اور 'ادبی کارواں' کی سرگرمیاں قابل قدر ہیں مگر اردو تہذیب اور اردو ادب کا جو جادو ہے وہ ابھی سر چڑھ کر نہیں بول رہا ہے۔ ہم ایسے خوبصورت پروگرام نہیں منعقد کر رہے ہیں جو اردو والوں کو احساس کمتری سے باہر نکالنے کے علاوہ اردو نہ جاننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ اردو

ذریعہ تعلیم کے اسکولوں اور کالجوں کے پروگرام کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو کے پروگرام بھی اساتذہ اور طلباء کے لیے محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔

روشنی خان : بھیونڈی میں ''لوک گیت'' پر ایک پروگرام ہوا تھا......

شمیم طارق : جی ہاں...... وہ پروگرام ساہتیہ اکادیمی کا تھا جو کاروان ادب بھیونڈی کے اشتراک سے منعقد ہوا تھا۔ میں اس میں مدعو نہیں تھا مگر پروگرام بہت بامقصد اور معیاری تھا۔ اس میں مراٹھی بولنے والوں کی اچھی تعداد بھی شریک ہوئی تھی اور ان لوگوں نے اس کی پذیرائی کی تھی۔ اردو والوں نے بھی اس پروگرام کو پسند کیا تھا مگر اس پروگرام کی جو رپورٹ اردو اخبارات اور رسائل میں شائع ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی تھی۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ایسا کرنا اپنی زبان اور تہذیب سے بے اعتنائی برتنے کے مترادف ہے!

سنا ہے اس سال ''لوری'' پر ایک پروگرام بھیونڈی میں ہی ساہتیہ اکاڈمی اور'' کاروان ادب'' کے اشتراک سے ہو رہا ہے۔ ایسے پروگرام کم منعقد ہوتے ہیں۔ ان میں موضوع کی بھی اہمیت ہوتی ہے اور اپنی زبان کو دوسری زبان بولنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی بھی۔ عصری حالات کو دیکھتے ہوئے ان کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

روشنی خان : اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟

شمیم طارق : امید پہ دنیا قائم ہے۔ میں اپنے مستقبل کے بارے میں بھی پر امید ہوں اور اردو کے مستقبل کے بارے میں بھی۔

☆☆☆

تقریر اور تحریر کی خداداد صلاحیتوں کے مالک

جناب شمیم طارق کی مشہور و مستند کتاب

تصوف اور بھکتی

(تنقیدی اور تقابلی مطالعہ)

تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

۲۸۸ صفحات۔ مجلد کتاب۔ قیمت ۲۷۵

مصنف سے رابطہ

شمیم طارق۔ موبائل نمبر 09224751077

فیض کے نعتیہ اشعار۔ ایک خوشگوار بحث

شمیم طارق

گزشتہ سال دسمبر میں بھیونڈی میں منعقدہ ایک سمینار میں راقم الحروف نے'' قرآن کی معجز بیانی اور شاعروں کا عجز'' کے عنوان سے جو مقالہ پڑھا تھا وہ بعد میں ''معارف '' (اعظم گڑھ) میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں کئی دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی تھی کی ''فیض احمد فیض جس فلسفہ کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اس میں روحانیت اور قرآن کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے مگر حیرت ہوتی ہے ان کے شعری مجموعوں میں ''حمد'' ''سورشِ زنجیر بسم اللہ'' ''دعا'' ویبقیٰ وجہ ربک'' اور ایسی کئی دوسری نظمیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے متاثر تھے اور اپنے اس تاثر کو شعری تجربے میں ڈھالنے میں انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔'' ان سطور کی بنیاد پر حیدرآباد کے ایک صاحب نے معارف کو خط لکھ کر سید ابوالخیر کشفی کے حوالے سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ فیض کی شاعری میں نعتیہ اشعار نہیں ہیں۔ انہی کے لفظوں میں 'فیض احمد فیض جدید اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہیں' کشفی صاحب کو لیلین ایوارڈ یافتہ اس شاعر سے شکوہ تھا کہ انہیں ان کے کلام میں کوئی نعت نظر نہیں آئی۔ ایک نشست میں فیض صاحب نے ان کی توجہ اپنے نعتیہ اشعار کی طرف دلا کر حیران کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ نے ہمدردی اور دل بیداری کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے ساتھ انھوں نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

کشفی مرحوم نے اس واقعہ کو من و عن درج کر کے مسلمانوں کی صدیوں سے جاری ضبط روایت کی منفرد شان کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ فیض کے تین نعتیہ اشعار ہدیۂ قارئین ہیں ؎

رنگ خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے
یہ جفائے غم کا چارہ وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ تری یاد روئے مریم
سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِ کریم تو تری رہگزر میں ہے

آخری شعر میں پیغام نبوت اور اتباع رسول مقبول ﷺ کو عرفانِ الٰہی کی واحد سبیل قرار دے کر فیض صاحب نے ذہانتوں پر محیط صحرانوردی کے بعد اپنا رخ سوئے حرم کر لیا۔ کشفی مرحوم نے ان نعتیہ اشعار کی کھوج لگا کر اردو غزل کے مطالعہ کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ اس مکتوب میں یہ بھی لکھا ہے کہ :

”ٹیلی ویژن کے ایک مذاکرے میں میں نے کہا کہ اردو کے ہر بڑے شاعر کے کلام میں ہمیں نعت نظر آتی ہے۔ شعرا اپنے دیوان یا کلیات کا آغاز نعت کے اشعار سے کرتے ہیں آج بھی یہ دستور قائم ہے لیکن عہد حاضر کے ایک بڑے شاعر کے کلام میں ہمیں نعت کا جلوہ نظر نہیں آیا۔ شائد یہ بات اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہی گئی کہ سننے والوں کا ذہن فیض صاحب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد بہن حاجرہ مسرور نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں وقت پر پہنچ گیا۔ فیض صاحب پہلے سے موجود تھے۔ دوسرے مہمان ابھی نہیں آئے تھے۔ میں نے فیض صاحب کو سلام کیا۔ انھوں نے بے دلی سے جواب دیا۔ یہ وہ فیض صاحب نہیں تھے جن سے میں واقف تھا۔ کمرے میں ایک خاموشی طاری تھی، ذہن میں آیا کہ فیض صاحب ناراض ہیں ' دل کا چور زبان پر آگیا۔

میں نے کہا فیض صاحب ! کیا بات ہے، آپ کچھ ناراض سے معلوم ہوتے ہیں۔ فیض صاحب نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ جس ذاتِ گرامی کے حوالے سے آپ نے ٹیلی ویژن پر اپنے غصے یا دوسروں کی کوتاہی کا جس طرح اظہار کیا تھا اس انداز کا اس ذاتؐ سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کسی گنہگار یا خطا کار کے کانوں میں جو بات کہنی چاہیے اس کو پوری دنیا میں پھیلانے کا خلقِ عظیمؐ سے کیا تعلق ہے؟ اور آپ ادب کے استاد ہیں کیا آپ طالب علموں کو اس بتِ ہزار شیوہ سے متعارف نہیں کراتے جسے غزل کہتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمدردی اور دل بیدار کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے بعد فیض صاحب نے اپنا شعر (شعر اوپر نقل کیا جا چکا ہے) پڑھا۔

اس مکتوب کو پڑھنے کے بعد ممبئی سے مولانا محمد شعیب اور علی گڑھ سے رئیس نعمانی صاحب نے جوابی مکتوب میں سوال اٹھایا کہ اگر کوئی شاعر اپنے کلام کا مطلب بتانے کے لیے زندہ نہ ہو تو اس کی غزل کے شعروں میں نعت کے شعر کس طرح تلاش کیے جائیں ؟ مثلاً۔

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

غزل کا شعر ہے حالانکہ اسے نعت کا شعر ہونا چاہئے کیونکہ نبی رحمت ﷺ کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسی شخصیت پیدا ہی نہیں ہوئی جس کے روئے انور پر آنکھ نہ ٹھہر سکے۔ لیکن چونکہ اس شعر کے خالق نے اس کو نعت کا شعر نہیں کہا ہے اس لیے کسی دوسرے شخص کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کو نعت کا شعر کہے ؟ مولانا محمد شعیب کوٹی صاحب مفسر قرآن اور عربی کے عالم ہیں۔ رئیس نعمانی نے شعر قرار دئے جانے سے متعلق جو سوالات قائم کئے وہ بہت اہم ہیں۔ سردار جعفری نے بھی فیض کی مشہور نظم ”یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر“ پر اسی قسم کا اعتراض کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ مصرعہ تو مسلم لیگی اور ہندو مہا سبھائی کی بھی ترجمانی کر سکتا ہے کیونکہ صبح آزادی میں اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں تھی۔ اگر فیض نے واقعی غزل کے ان شعروں کو نعت کے شعر کے طور پر تخلیق کیا تھا تو ان کو استفسار سے پہلے ہی اس کا ذکر کرنا چاہیے تھا مگر یہی نہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا، ان کی زندگی میں شائع ہونے والے کسی مجموعہ کلام میں نعت کے عنوان سے کوئی شعر یا نظم نہیں ہے۔ ان کی کلیات ”نسخہ ہائے وفا“ کے بلکل آخر

میں ایک نعت ضرور ہے جس کا ایک شعر ہے۔

آتش فشاں زِ قہر وملامت زبانِ شیخ
از اشک تر زِ دردِ غریباں ردائے تو

مگر یہ نعت کلیات کے اس حصے میں ہے جو غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کے باوجود حسن ظن کا تقاضہ ہے کہ فیض نے نعت کے علاوہ اپنی غزلوں کے جن شعروں کو نعت کا شعر کہا ہے ان کو نعت کا ہی شعر سمجھا جائے۔ البتہ مولانا محمد شعیب کوٹی صاحب اور رئیس نعمانی صاحب کے خطوط کی روشنی میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کرام نعت کے شعروں کو نعت کے ہی عنوان سے پڑھیں اور شائع کریں تا کہ بعد والوں کو ان کا مفہوم متعین کرنے میں دشواری نہ ہو۔ استعارہ آمیز زبان کا مفہوم متعین کرنا سب کا کام نہیں ہے اور پھر نعت کی صنف تو عقیدت ومحبت اور ایمان واخلاص کے اظہار کا نتیجہ ہے اس کے لیے استعارے کا پردہ اس حد تک تو صحیح ہے کہ شعری حسن میں اضافہ ہو جائے لیکن اس حد تک نہیں کہ شعر کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہو۔ حال ہی میں کسی شاعر کی نعت نظر سے گزری تھی اس میں شاعر نے ”رب روشنی“ کی ترکیب استعمال کی تھی جو بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ مگر ہر شاعر میں یہ کمال نہیں ہوتا کہ وہ تمام شعری محاسن یا استعارہ آمیز زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے کیا۔ بیانیہ انداز میں بھی نعت کے شعر کہہ سکے۔ مجروح سلطان پوری کے اس بیان کا یہ راقم الحروف گواہ ہے کہ ”نعت کہنا بہت مشکل ہے میں نے کوشش کی مگر دو تین مصروں سے آگے نہیں کہہ سکا۔“ فیض اس معنی میں خوش نصیب تھے کہ انھوں نے اپنی غزلوں مین نعتیہ شعروں کی نشاندہی کر دی۔

ایک ایسے دور میں جب نعت کہنے ' سننے اور نعتیہ مشاعروں کا انعقاد ختم ہوتا جا رہا ہے، خاکسار کے مقالے کے حوالے سے جو بحث چلی ہے اس کے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع غلط نہیں ہے اس لیے اہل بھیونڈی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسا سیمینار منعقد کیا جو اہل ادب کو نئی سوچ سے ہمکنار کر رہا ہے اور فیض کی شاعری کا ایک نیا پہلو سامنے آ رہا ہے۔ کاش یہ پہلوان شاعروں کے لیے درس عبرت بنے جو نہ تو نعت کہنے کی قدرت رکھتے ہیں نہ مجروح کی طرح اس اعتراف کا حوصلہ پیدا کر پاتے کہ نعت کہنا ہمارے بس میں نہیں۔ یہ بہت مشکل صنفِ سخن ہے۔ میرے نزدیک نعت گوئی کا تعلق قادر الکلامی سے زیادہ توفیق سے ہے۔ نعت وہی کہتا ہے جس کو نعت کہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے چاہے وہ غیر مسلم ہو۔ ہماری شعری روایت میں نہ تو ایسے مسلمان شاعروں کی کمی ہے جنہوں نے عمر بھر شاعری کی مگر نعت کا ایک مصرعہ موزوں نہ کر سکے، نہ ہی ایسے غیر مسلم شاعروں کی کمی ہے جنہوں نے بڑی خوبصورت نعتیں کہی ہیں۔

(ماخوذ روزنامہ ”اردو انقلاب“، ممبئی۔

☆☆☆

گوشہ، محمد ادریس رضوی ایم۔اے

☆ توشیحی نظم — نذیؔر فتح پوری — ۱۷

☆ محمد ادریس رضوی کی تحسین شناسی۔...... پروفیسر مجید بیدار۔ — ۱۹

☆ مولانا ادریس رضوی کی علمی و ادبی خدمات کی ربع صدی۔۔ ڈاکٹر منظور احمد دکنی۔ — ۲۵

☆ مولانا محمد ادریس رضوی کی ادبی جہتیں:...... مولانا توفیق احسن برکاتی، ممبئی — ۲۹

☆ منظوم تبصرہ۔ بر دیوانِ رضوی:...... سید شاہ یوسف حسینی کامل۔ — ۳۶

☆ کلام رضوؔی کی بدیعی پیائش:...... محمد کاشف رضا شاؔد مصباحی، ایم۔اے، ایم فل۔ — ۴۰

☆ کلامِ راہؔی صنائع و بدائع کے حوالے سے:...... جناب قمر سنبھلی۔ — ۶۶

☆ حمد ربّ ذوالجلال — ۶۸

☆ نعتیں — ۷۱

☆ رباعیات — ۷۳

محمد ادریس رضوؔی جامع مسجد۔ پتری پُل۔ پوسٹ کاٹے منولی۔ کلیان (ممبئی)

Mohammed Idris Razvi

JamaMasjid,Patri Pool,P.O.Katemniwali

Kayan.Maharashtara-421306(Mumbai)

Mob-9869781566-9029766152

توشیحی نظم

ادیب شہیر، قاری محمد ادریس

نذیؔر فتح پوری

ا اے خدا بندوں کا تیرے جب بھی لکھوں تذکرہ
روشنی مہر و محبت کی مجھے کیجو عطا
د دور جو نظروں سے ہیں لیکن ہیں وہ دل کے قریب
نام ہے ادریس، قاری بھی ہیں اور ہیں وہ ادیب
ر یہ جو اتنی خوبیاں قدرت نے بخشی ہیں انھیں
ہیں یہ اتنی ساری قرطاس وقلم کی برکتیں
ی بے زباں جذبات کو یہ دیتے ہیں اکثر زباں
لکھتے رہتے ہیں ہمیشہ زندگی کی داستاں
س شاہ راہِ فکر و فن کے ہیں مسافر بالیقیں
آپ کے قدموں تلے ہے کامیابی کی زمیں
ہ ہر طرف ہے بول بالا آپ کی تقریر کا
اک زمانہ معترف ہے آپ کی تحریر کا
ی یہ صنائع اور بدائع کے بھی پارکھ ہیں جناب
لکھ چکے ہیں ایسے موضوع پر بھی اک اعلیٰ کتاب
ر رابطہ رکھتے ہیں یہ ہر وقت عام وخاص سے
جس سے بھی ملتے ہیں، ملتے ہیں بڑے اخلاص سے
ق قمقمے فکرونظر کے آپ نے روشن کیے
اور جلائے آگہی کے آپ نے پَل پَل دیے
ا اورادب کی روشنی سے دل منور کرلیا
اپنا دامن جوہرِ علم و ہنر سے بھرلیا
ر رحمتوں کے سائے میں گزری ہے ساری زندگی
آپ نے قرآن سے پائی ہے پَل پَل روشنی

ی یہ تخیل کے پرندے یہ تصور کی اُڑان
چھولیا ہے آپ نے ''علم وہنر'' کا آسمان
م ماہ تاباں سوچ ہے اور آفتابی ہے مزاج
ایسے ہی افراد کو ملتا ہے کاموں کا خراج
ح حمدِ باری بھی لکھی اور نعتِ احمد بھی لکھی
نوراورایمان کی پھیلائی کیسی روشنی
م مشکلیں آسانیوں میں ڈھل گئیں یوں بھی ہوا
آپ کو جہدِ مسلسل کا ملا ہے یہ صلہ
م مال وزر سے آدمی پاتا نہیں ہے جو وقار
شاعری حسّاس دل کو بخشتی ہے وہ قرار
د درد کی تصویر لفظوں میں اُتاری آپ نے
فکروفن کی خوب تقدیریں سنواری آپ نے
ا اہلِ علم وفن سے رکھا ہے ہمیشہ واسطہ
سچ کی جانب لے چلے ،ایسا چُنا ہے راستہ
د داد اور تحسین کی رکھی نہ دل میں آرزو
بس رہی ہے، ہرقدم پر علم ہی کی جستجو
ر رابطوں اورضابطوں کے درمیاں گزری حیات
دن کو لکھا دن ہمیشہ، رات کو لکھا ہے رات
ی یاوری قسمت نے کی تو راستے سب کھل گئے
دور تک روشن ہوئے ہیں کامیابی کے دیے
س ساری سمتوں سے مبارک بادیاں آنے لگیں
کامیابی کی فضائیں خوب لہرانے لگیں

دعائیہ

یا الٰہی ہے دعا یہ قافلہ چلتا رہے
ہر قدم پر بس چراغِ آگہی جلتا رہے
اوربڑھتی ہی رہے فکر و نظر کی روشنی
چاروں جانب پھیلتی جائے سُخن کی چاندنی

☆☆

محمد ادریس رَضوی کی تحسین شناسی

پروفیسر مجید بیدار صاحب: صدر شعبۂ اردو، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد

اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کے بعد کسی انسان کی اگر کوئی متاعِ عزیز ہوسکتی ہے تو وہ بلاشبہ حُبِ رسول ہے جس کے بغیر نہ تو دین مکمل ہوتا ہے اور نہ ہی ایمان کی تکمیل ممکن ہے۔ کسی انسان کی محبت کو جانچنا اور اُس کے دل میں چھپے ہوئے عشق کو تلاش کرنا سخت دشوار ہے اور یہ بھی خدا کی ایک بہت بڑی نعمت ہے کہ اُس نے انسان کو حیوانِ ناطق بنا کر اظہار کے توسط سے اُس کے دل میں چھپی ہوئی محبت کو جانچنے کا سلیقہ بخش دیا۔ ہر مسلمان اپنے دل میں پیغمبرِ اسلام کی محبت کو جاری وساری رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ وصف اظہار کے توسط سے اگر کسی کی زبان سے ادا ہوسکتا ہے تو بلاشبہ شاعر کی زبان ہی وہ بہترین وسیلہ ہے جس کے توسط سے حُبِ نبوی کی تپش وحرارت کو نہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بلکہ اُس کے توسط سے پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں میں بھی آتشِ عشق کی سوزش محسوس کی جاسکتی ہے اِسی لیے عشقِ نبوی کے اظہار کو شاعری میں بیان کرنے والے انسانوں کو اعلیٰ علیین میں جگہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اردو شاعری میں نعت گوئی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے توسط سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوہ ریزیوں کو ایک شاعر اہتمام کے ساتھ بیان کرتا اور اپنی دلی کیفیت کو لفظوں کی بندشوں سے وابستہ کر کے ایسا ماحول پیدا کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے حُبِ نبوی کے شرارے تیز ہونے لگتے ہیں اِسی لیے نعت گوئی کو مذہبی شاعری میں اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ بلاشبہ ایسے شاعر جو نعت کے توسط سے پیغمبرِ اسلام کی مدحت کا حق ادا کرتے ہیں وہ نہ صرف دنیا میں سُرخرو ہونگے بلکہ آخرت میں بھی اُن کی نجات کا سامان میسر آئے گا۔ سرزمینِ ہندوستان میں اردو زبان کے آغاز سے ہی نعت گوئی کے وصف کو پروان چڑھانے والے شاعروں کا ایک اہم قافلہ دکھائی دیتا ہے اور اُس قافلے میں شامل ہونے والے عصرِ جدید کے شاعروں میں محمد ادریس رَضوی کا بھی شمار ہوتا ہے جو بلاشبہ سرزمینِ بہار کے علاقے دربھنگہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنی پاکیزہ فطرت اور نکھری ہوئی صلاحیت کی وجہ سے دینی مدرسے کے عالم اور مذہبی تعلیم سے وابستہ ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے ریاست مہاراشٹرا کے کلیان علاقہ میں سکونت اختیار کر کے نہ صرف اپنی مذہبی تعلیم کی تکمیل کی بلکہ میسور یونیورسٹی سے ایم۔ اے اردو کا امتحان بھی کامیاب کیا۔ وہ نہ صرف حافظ وقاری ہیں بلکہ فارسی کے بھی مزاج داں ہونے کے علاوہ مفتی اعظمِ ہند مصطفیٰ رضا نوری سے بریلی شریف کے واسطے سے بیعت کا سلسلہ بھی رکھتے ہیں۔ غرض دربھنگہ کے الحاج محمد منیف کے صاحبزادے محمد ادریس نے ۲۰؍جولائی ۱۹۵۸ء میں آنکھ کھولنے کے بعد مسلسل دین کی خدمت کو اپنا رویہ بنا کر جس انداز کی شاعری کی اُسے بلاشبہ حدائقِ بخشش کا وسیلہ قرار دیا جاسکتا ہے، چنانچہ انہوں نے اب تک جتنے شعری مجموعے شائع کیے انہیں اعلیٰحضرت امام احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ سے استفادے کے نتیجے میں نغماتِ بخشش، وسیلۂ بخشش اور سبیلِ بخشش کے عنوانات سے شائع کیا اس طرح محمد ادریس رَضوی کی شاعری نہ صرف اُن کی اپنی فکر کا نتیجہ ہے بلکہ اُس پر حضرت امام رضا خاں بریلوی کی عشقیہ کیفیت اپنی نور افشانیاں کرتی نظر آتی ہے۔ غرض محمد ادریس رَضوی نے

اپنے دیوان کو جہاں ''دیوانِ رَضوِیؔ'' یعنی ''صدائے بخشش'' کا عنوان دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ رَضوِیؔ کا دیوان جو نعتیہ خیالات سے معمور ہے وہ نہ صرف صدائے بخشش کا کام انجام دے گا بلکہ اِسی کے توسط سے شاعر کو روحانی سکون حاصل ہوگا چنانچہ آج کے دور کا مسلمان خود کو روحانی مسرّت اور بصیرت سے آراستہ کرنا چاہتا ہے تو اُسے بلا شبہ ''صدائے بخشش'' یعنی دیوانِ رَضوِیؔ کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس دیوان میں محمد ادریس رَضوِی نے نعتیہ افکار کے ایسے گلشن سجائے ہیں کہ جن کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے خداداد صلاحیتوں کے استعمال کے لیے شاعری کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا ہے، اُن کی فکر کی بلندی اور شاعری پر دسترس نہ صرف شعر گوئی سے ہم آہنگ کرتی ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ خدا نے ایک انسان کی شکل میں محمد ادریس رَضوِی کو اُن تمام صلاحیتوں سے مالا مال فرمایا ہے جو بلا شبہ تقدیسی شاعری کا اہم وسیلہ ہے اور نعت کے توسط سے محمد ادریس رَضوِی نے جاں نثاری کا حق ادا کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُن کا دیوان نہ صرف رضا کا پیام ہے بلکہ اس سے بخشش کی صدا بھی بلند ہوتی ہے۔

تقدیسی شاعری کے لیے کسی بھی صنف اور روییے کی پابندی نہیں بلکہ شاعر اپنے خیال کو پیش کرنے کے لیے ہر قسم کی روش کو اپنی شاعری میں جگہ دے سکتا ہے لیکن اس بات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ ایسی شاعری کے دوران تقدّس پامال نہ ہو اور لفظوں کے دروبست سے بلند خیالی کے علاوہ دل بستگی اور وجد آفرین خیالات کی نمائندگی ہوتی رہے۔ محمد ادریس رَضوِیؔ کی نعتیہ شاعری کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے غزل کی ہیئت میں ہی نہیں بلکہ مسدّس اور دوسری ہیئتوں میں بھی نعتیں لکھی ہیں لیکن جس شدّتِ روانی کے ساتھ اُن کی نعت دل پر تاثر چھوڑنے کا حق ادا کرتی ہے یہ انداز بہت کم شاعروں کے کلام میں دکھائی دے گا۔ برجستگی اور روانی محمد ادریس رضوی کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے اور انہوں نے دیوان کو سجانے کے لیے تمام حروفِ تہجّی کا استعمال کرتے ہوئے رواں بحروں اور سادہ الفاظ کے توسط سے ایسی دل کی دنیا سجائی ہے کہ جس کا کوئی مول نہیں۔ طویل بحروں کے علاوہ مختصر بحروں میں بھی نعتیہ کیفیات کو پیش کرنے کا سلیقہ محمد ادریس رَضوِیؔ کو خوب آتا ہے، خیال کو جس روانی کے ساتھ وہ لفظوں میں پرو کر شاعرانہ خصوصیات سے مالا مال کرتے ہیں اس قسم کی خصوصیت بہت کم شاعروں میں دیکھی جاتی ہے۔ محمد ادریس رَضوِیؔ کی شاعری کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے بیجا تراکیب اور حُسن کاری کے علاوہ شعری صنعتوں کے استعمال سے اجتناب برتتے ہوئے رواں اور عام الفاظ کے توسط سے ایسی نعتیہ شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدحتِ رسول کے لیے خدا نے اُن کی شعری لفظیات کو مختص کر دیا ہے اور جس روانی کے ساتھ وہ لفظوں میں کیفیت کو پیوست کرتے ہیں اُس کی خصوصیت پُر گو شاعروں میں بھی ملنی مشکل ہے۔ چھوٹی بحروں میں بھی اس قدر رواں اور جامع شعر نعتیہ خصوصیات کے ساتھ نمایاں کیے ہیں کہ بلا شبہ محمد ادریس رَضوِیؔ کی شاعری پر دل و دماغ عش عش کرنے لگتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا بھرپور استعمال اگر کسی نے اپنے نطق کے ذریعے کیا ہے تو بلا شبہ وہ محمد ادریس رَضوِیؔ ہیں اور اُن کی نعتیہ شاعری میں تکرارِ لفظی سے جو حُسن پیدا ہوتا ہے اُس کی مثال بھی کسی دوسرے شاعر کے کلام سے پیش کرنا سخت دشوار ہے۔ ایک یا دو لفظ سے محبت کے جذبے کو لبریز کر کے وہ جس انداز سے کیفیاتی فضا پیدا کرتے ہیں اُس کے لیے اُن کی نعت کے چند شعر پیش ہیں:

آرزو، آرزو، آرزو، آرزو
تو ہی تو، تو ہی تو، تو ہی تو، تو ہی تو
آبرو، آبرو، آبرو، آبرو
میری تو، میری تو، میری تو، میری تو

روبرو، روبرو، روبرو، روبرو
گفتگو، گفتگو، گفتگو، گفتگو
ہے یہی میرے دل کی سدا آرزو
میرے ھو، میرے ھو، میرے ھو، میرے ھو

اس نعت میں شاعر نے لفظوں کے دروبست کے ذریعے جس قسم کی کیفیاتی فضا تیار کی ہے اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ شاعر کو نہ صرف اپنے جذبے پر بلکہ شاعری پر اس قدر قابو ہے کہ وہ ہر لفظ کی تکرار سے کیفیاتی فضا پیدا کرنے کا سلیقہ رکھتا ہے تب کہیں جا کر شاعری میں دل گرفتگی پیدا ہوتی ہے۔ اُن کی نعت کے ان چار اشعار سے خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روحانی طور پر جس بندے کو اللہ تعالیٰ بلندیوں تک پہنچاتا ہے اسی کی زبان سے اس قسم کے الفاظ کی ادائیگی ممکن ہے ورنہ لفظوں کے توسط سے کیفیت کو سمیٹنا ایک مشکل کام ہے، یہ جذبہ خدا کی ذات سے جس کو عطا ہو جائے اُس کی زبان اور شاعری ہی نہیں بلکہ اس کی شخصیت بھی پاک اور مطہّر ہو جاتی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے ایک ایک لفظ کو باوضو کر کے انہیں صف میں کھڑا کر دیا ہے، یہ امتیازی خصوصیت محمد ادریس رَضوِیؔ کی نعتیہ شاعری کی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ جذبے میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں جس کی وجہ سے پڑھنے اور سننے والے پر وجد آفریں کیفیت طاری ہوتی ہے اور ہر شعر آنکھوں اور کانوں کے توسط سے دل میں اُتر کر کیفیاتِ دلی کو بدلنے کی صلاحیت سے مالا مال نظر آتا ہے اور یہ ایسی خصوصیت ہے جو بلا شبہ اللہ تعالیٰ جس کے مقدر میں لکھنا چاہتا ہے وہی اسمِ اعظم کا علمبردار ہو جاتا ہے۔

محمد ادریس رَضوِی نے نئے نئے قافیے اور ردیف میں لفظوں کی تکرار کے توسط سے حُسن کاری کا نیا انداز پیش کیا ہے اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے لفظوں کے ذریعے شاعری نہیں کی بلکہ کیفیاتِ دلی کو لفظوں میں پرونے کا کارنامہ انجام دیا ہے، یہ کیفیت نہ صرف طویل بحروں والی نعتوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے بلکہ مختصر بحروں والی نعتوں میں بھی اس قسم کی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لطف کو دوبالا کرنے کے لیے طویل بحر کی ایک نعت کے چند اشعار پیش ہیں:

گنہ کو اپنے مٹا رہا ہوں، نظر میں روضہ بسا بسا کر
ادب سے سر کو جُھکا رہا ہوں جبیں میں سجدے سجا سجا کر
حبیبِ اکبر، نبیِ اکرم، طبیبِ افضل، امامِ مُرسل
صدا سے پہلے ،گدا کو دیتے ہیں لعل و گوہر اُٹھا اُٹھا کر
خدا کے دلبر، غریب پرور، ہمارے سرور، جہاں کے رہبر

دکھا رہے ہیں ، خدا کا رستہ، سبھی کو اپنا بنا کر
خدا کے بندے، نبی کی اُمت، پکڑ لو دامن، نبی کا اپنے
دلا رہے ہیں، ارم کی منزل، خدا کو اپنے منا منا کر
نہ آپ آتے، نہ بزم سجتی، نہ راز کُھلتا، نہ راہ ملتی
نہ عشق ہوتا، نہ اشک بہتے، نہ نعت پڑھتا سُنا سُنا کر

بحرِ طویل میں کیفیاتی فضا کو تعمیر کرنے کے لیے شاعر نے پہلے مصرعے میں مدحتِ رسول کے لیے جن القاب کی مکمل صورت گری اور معنویت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اظہار کی نئی بندش کا وسیلہ اختیار کیا ہے اُس سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ حُبِ رسول کو ہر قسم کی شعری روش میں نمایاں کرنے کی صلاحیت شاعر میں بدرجۂ اتم موجود ہے اور وہ عشقِ نبوی میں اس قدر سرشار ہے کہ اُس کے شعر میں شامل ہونے والا ہر لفظ عشقِ نبوی کی کیفیت سے مالا مال ہو کر معنویت کی ایک نئی دنیا سجاتا ہے اور اس قسم کی خاص کیفیت محمد ادریس رَضوی کی نعتیہ شاعری میں محسوس کی جاسکتی ہے۔

غزل کے لب و لہجے میں نعت لکھ کر مدحِ محمدی کا حق ادا کرنا محمد ادریس رَضوی کی فطرت میں شامل ہے۔ ''دیوانِ رضوی'' کا لکھا ہوا تمام کلام حروفِ تہجی کی نمائندگی کرتا ہے اور تمام تر شاعری عشقِ نبوی سے مالا مال ہے، اِس کے علاوہ قطعات اور رباعیات میں بھی شاعر نے حُبِ نبوی کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ منقبتی انداز بھی اختیار کیا ہے۔ غزل کی زمین کو نعت کے لیے مختص کرنے کا رجحان اردو شاعری میں کوئی نیا نہیں اور قدماء کے دور سے ہی یہ روایت چلی آرہی ہے لیکن محمد ادریس رَضوی نے دو رکنی اور سہ رکنی لفظوں کے ذریعے بھی نعت کا ایوان سجا کر فنِ نعت پر اپنی گہری دسترس کا ثبوت فراہم کیا ہے، اس کے علاوہ اُن کی نعتیہ شاعری کی خوبی یہ ہے کہ نئے نئے انداز کے قافیوں کے توسط سے دلی جذبات کی نمائندگی پر انہیں پورا کمال حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نعتیں کیفیاتی فضا کو نمایاں کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہیں۔ نئی نئی ردیفوں میں نعتیہ شعر کہہ کر روحانی دنیا کو آباد کرنے کا خصوصی وصف محمد ادریس رَضوی کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے، اس کی نمائندگی کرنے کے لیے ردیف کی معنویت سے بھرپور ایک نعت کے چند اشعار پیش ہیں:

سدا سے یہ کہتی صدا ہے کسی کی
تری جستجو میں فنا ہے کسی کی
ترے در پہ تجھ کو منانے چلی ہے
جھکا کر نگاہیں دُعا ہے کسی کی
مرے سامنے سے گذر جو گئی ہے
دِکھا کر چمک کر ادا ہے کسی کی
نہ پردہ اُٹھاتا نہ ہوتا فدا میں
محبت میں میری رضا ہے کسی کی
دُعا میری مقبول ہوگی یقیں ہے

بھروسا دلاتی ولا ہے کسی کی
مری جان، میری نظر، میرے دل کو
منور جو کرتی ضیا ہے کسی کی

غزلیہ انداز کے عاشقانہ رنگ کو نعت میں بیان کر کے کیفیاتی فضا فراہم کرنے کا جو انداز ان اشعار میں نمایاں ہوتا ہے وہ بلاشبہ محمد ادریس رَضوی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ وہ جہاں طویل بحروں کے ذریعے نعت گوئی کا حق ادا کرتے ہوئے دلی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں وہیں مختصر بحروں میں بھی نعت کے لوازمات کو پیش کرنے کے حُسن سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ طویل بحر میں اُن کی ایک نعت کے چند اشعار پیش ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد ادریس رَضوی نے استفادے کی گنجائش کو بھی اپنی نعتیہ شاعری میں برقرار رکھا ہے۔

چمکتے ہوئے مہر نے آسماں سے زمیں پر جو دیکھا سویرے سویرے
تو دل کو جُھکا کر نظر کو گِرا کر نبی کو پکارا سویرے سویرے
زمیں سے زماں تک، مکیں سے مکاں تک، فلک سے مَلک تک، یہاں سے وہاں تک
سبھی کہہ رہے تھے بشکلِ محمد یہ جلوہ ہے چمکا سویرے سویرے
بدی کی گھٹا منہ چُھپا کر کھڑی تھی، جفا بھی سہم کر کہے جا رہی تھی
محمد کی آمد نے سب کو بچایا ، جہاں کو سجایا سویرے سویرے

فضا بندی اور نعت کے توسط سے طویل بحر کو نبھانے کا جو انداز ''دیوانِ رضوی'' کا خصوصی وصف ہے وہ بہت کم شاعروں کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ محمد ادریس رضوی نے دو رُکنی اور سہ رُکنی تراکیب کے ذریعے بھی نعت کے گلشن کو سجایا ہے چنانچہ ایک نعت جو دو ارکان پر مشتمل اور آخری رُکن کو مردّف بنا کر شاعر نے فن کی جس گہرائی کو پیش کیا ہے اُس کی گہرائی اور گیرائی کے بیان کے لیے دو رُکنی نعت کے اشعار بطورِ نمونہ پیش ہیں۔

ہے چمن اپنا من
کہہ نہ اب بے وطن
خوب ہے تن میں دھن
جانِ جاں میرا من
پاک ہے سارا تن
رکھتا ہے حُسنِ ظن
پاک سب فکر و فن
تیری ہی ہے لگن
ہے دُعا جانِ من

لفظوں کے توسط سے محمد ادریس رَضوی نے نعت کے ذریعے سے پیکر کو پیش کرنے اور اُسے ڈھالنے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کے دیوان میں شامل کن کن محاسن کا ذکر کیا جائے اور کون کون سی شاعرانہ خوبیوں کو پیش

کیا جائے۔غرض یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ محمد ادریس رَضوی نے ''صدائے بخشش'' خود نہیں لکھی بلکہ خدا نے اُن کی زبان سے یہ اشعار خود کہلوائے ہیں یہی وجہ ہے کہ ''دیوانِ رضوی'' کا ہر شعر آمد ہی آمد کی نمائندگی کرتا ہے۔اس قسم کے خوب صورت نعتیہ شعری دیوان پیش کرنے کے لیے نہ صرف محمد ادریس رَضوی کو مبارک باد پیش کی جانی چاہیے بلکہ اُن کے خیالات کا احترام بھی کیا جانا چاہیے کیونکہ یہ خیالات لفظوں ومعنی کی سطح پر اُسی وقت اُبھرے ہیں جب کہ خدائے رب العزّت کی جانب سے انہیں توفیق عطا ہوئی ہے۔غرض اُن کے شعری مجموعے کو جو دیوان کی شکل میں شائع ہوا ہے اُسے توفیقِ خداوندی کا درجہ دیتے ہوئے یہ توقع کی جاتی ہے کہ نہ صرف اس کا استقبال کیا جائے گا بلکہ اس کے مطالعے کے ذریعے روحانی دنیا کو منور اور معطّر کرنے کی کامیاب سعی کی جائے گی۔غرض ان کلمات کے ذریعے محمد ادریس رَضوی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے اُن سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ ضرور بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہو کر ہدیۂ تشکر پیش کریں کہ خداوندے قدّوس نے انہیں پاک وصاف اور ستھرے خیالات کو پیش کرنے کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور یہ ایسی دولت ہے جو نہ صرف آخرت کا سامان ہے بلکہ بخشش کا ذریعہ بھی ہے۔غرض شاعر نے جو صدائے بخشش لگائی ہے اُس سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس آواز کو بارگاہِ خداوندی میں مقبولیت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور توقع ہے کہ اس کے مطالعے کے ذریعے قارئین بھی صدائے بخشش کی باریابی کا موقع فراہم کرلیں گے۔

☆☆☆

نمونۂ کلام

ہیں آنکھیں کسی کی تو صورت کسی کی　　پسِ پردہ ہے ان میں طلعت کسی کی
سنورتا ہے گلشن چہکتی ہے بلبل　　ادائیں کسی کی اشارت کسی کی
غمِ زندگی کی حقیقت کو سمجھو　　حکایت کسی کی مشیّت کسی کی
سلامت رہے عاشقوں کی ادائیں　　دعائیں کسی کی اجابت کسی کی
مرے حق میں وا ہوگیا بابِ الفت　　ہے شفقت کسی کی عنایت کسی کی
اچھل کر یہ کہتا مرا دل ہے مجھ کو　　محبّت میں تیری ہے حکمت کسی کی
بنا کر مجھے پردہ در پردہ کیا ہے　　چھپی پردے میں ہے حقیقت کسی کی
لئے جارہی ہیں وہ منزل کی جانب　　حمایت کسی کی رفاقت کسی کی
ذرا کھول کر دیکھئے اپنی آنکھیں　　نزاکت کسی کی ہے نزہت کسی کی
حقیقت کی منزل پہ جا کر جو دیکھا　　بصارت کسی کی ہے نعمت کسی کی
مٹا کر رہے گی گناہوں کو میرے　　سیادت کسی کی تو رحمت کسی کی
مرے عشق کو آشنا کر رہی ہیں　　محبت کسی کی تو رافت کسی کی
بسائے ہوئے ہوں مَیں اپنی نظر میں　　شباہت کسی کی حقیقت کسی کی
لئے جارہی ہیں وہ جنّت میں مجھ کو　　شفاعت کسی کی عنایت کسی کی

نظامِ جہاں پر کرو اک نظر تم　　کسی کی ہے محنت تو حکمت کسی کی
چھپائے ہوئے خود کو اپنی خودی میں　　سدا کر رہا ہے زیارت کسی کی
اُٹھا کے جو پردے کو رَضوی نے دیکھا　　حیا میں چھپی ہے یہ غیرت کسی کی

نمونۂ رباعی

یہ نازو ادا حسن و جوانی کب تک　　یہ جوش و نشہ وصل و روانی کب تک
اک روز تو ہر چیز چلی جائے گی　　پھر رنگ، ترنگ رات سہانی کب تک

☆☆☆

مولانا ادریس رضوی کی علمی وادبی خدمات کی ربع صدی

ڈاکٹر منظور احمد دکنی، گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ

بیسویں صدی عیسوی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور ادبی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔بیسویں صدی انقلابات سے عبارت ہے۔اس عہد میں ہندوستان میں جتنی تحریکیں اٹھیں ان کی گونج ادبی اور مذہبی حلقوں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ان تحریکات کو آگے بڑھانے اور انہیں کامیابی دلانے میں اردو زبان نے قابل قدر کام کیا۔20ویں صدی کی یہ آخری دہائی مولانا ادریس رضوی کی علمی وادبی زندگی کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔جس میں مولانا نے اپنی علمی وادبی زندگی کی ابتدا کی تھی۔ادریس صاحب کی تحریروں میں صوفیائے کرام کے افکار ونظریات کا گہرا اثر ملتا ہے۔اس کے علاوہ موصوف کا ادبی عقیدہ ان کے مذہبی عقیدے سے الگ نظر نہیں آتا۔اس طرح مولانا نے مثبت نظریے کے ساتھ اپنا علمی وادبی سفر شروع کیا۔مولانا کا قلم آج بھی رواں ہے اور ادب وزندگی کا نور بکھیر رہا ہے۔

اگر چہ شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں سماجی اور معاشرتی نظام معاون ومددگار بنتا ہے تاہم اسکے پہلو بہ پہلو مخصوص ذاتی وخاندانی پس منظر بھی اہمیت رکھتا ہے۔کیونکہ انسان اپنے گردوپیش کے ماحول سے اخذ واستفادہ کرتا ہے۔مولانا محمد ادریس رضوی دربھنگہ کے ایک چھوٹے قصبہ مدلمن میں الحاج محمد منیف صاحب کے گھر ۲۰ جولائی ۱۹۵۸ء کو اس عالم آب وگل میں تشریف لائے۔ابتدائی پانچ سال اپنے گاؤں کے اسکول سے تعلیم حاصل کی۔بعد ازاں ابتدائی دینی تعلیم کے لئے اپنے ہی گاؤں کے مدرسہ میں داخل ہوئے۔ابتدائی دور کے اس دینی ومذہبی ماحول نے ان کی شخصی تعمیر میں اہم رول ادا کیا۔اس کے بعد اپنی دینی ومذہبی تعلیم مختلف مدرسوں جیسے دارالعلوم احمدیہ، مدرسہ عزیزیہ اور دارالعلوم حیدریہ معینیہ سے مکمل کی۔اسی آب وگل کے ماحول میں مولانا کا بچپن گذرا۔مدرسہ ایجوکیشن عربی فارسی بورڈ بہار سے ۱۹۸۰ء میں وسطانیہ، فوقانیہ اور مولوی کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔اسی دور میں روحانی فیوض وبرکات حاصل کرنے کے لئے شرفِ بیعت حاصل کیا اور روحانی تربیت پانے لگے۔۱۹۸۸ء کو بہار سے ہجرت کرتے ہوئے کلیان مہاراشٹرا کو اپنا وطن ثانی بنایا۔اور آج بھی اس علاقے میں علمی، ادبی اور مذہبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔مولانا کی ابتدائی تعلیم بہار میں ہوئی لیکن کلیان منتقلی کے بعد اعلی تعلیم کی طرف

رجوع بکار ہوئے اور میسور یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

مولانا محمد ادریس رضوی نے ایک واضح تنقیدی نظریے کے ساتھ اپنا علمی وادبی سفر شروع کیا اور اپنی پہلی کتاب ''ماہتابِ رسالت کی جلوہ ریزیاں'' قلم زد کیا۔ اور اسے غوثیہ پبلشر الہ آباد نے ۱۹۹۰ء کو شائع کیا۔ کلیان کے ایک مخصوص ادبی وعلمی حلقہ میں اس کی پذیرائی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا اپنی پہلی تصنیف کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو حلقوں میں متعارف ہوئے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا آفتاب قاسم صاحب ڈربن ساوتھ افریقہ نے اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرکے امام مصطفیٰ رضا سنٹر ڈربن سے ۲۰۰۹ء کو ''مینی فیسٹیشن آف دی مون آف پروفٹ ہوڈ'' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے علاوہ سیرت فاونڈیشن گلبرگہ کی جانب سے ۲۰۱۳ء میں بھی اس کی اشاعت سوم منظرِ عام پر آئی۔

سیرت رسول ﷺ پر ہر زبان میں کتابیں شائع ہوئیں۔ اردو میں بھی مقتدر ادباء اور قلم کاروں نے حضرت رسول ﷺ کی زندگی کے گوشوں کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا۔ حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات اور پیغامات کی فی زمانہ زیادہ ضرورت ہے۔ سیرت رسول ﷺ پر عمل پیرا ہوتے ہوئے موجودہ دور کا انسان اپنی زندگی کو مثالی بنا کر ایک مثبت معاشرہ کی تشکیل وتعمیر کرسکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ''ماہتابِ رسالت کی جلوہ ریزیاں'' کے پیشِ لفظ میں مولانا نے بڑے پتے کی بات کی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''وقت کا بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ تمام خصوصیات ہم سے رخصت ہوگئیں جن سے دوسری قومیں عبرت حاصل کرتی تھیں۔ ہمارا عروج زوال سے بدل گیا ہے۔ نوجوان دوستو! آپ نے کبھی غور کیا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ بات بالکل واضح ہے کہ یہ ہماری غفلت وجہالت کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے سیرت رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ چھوڑ دیا۔ تحقیق کا میدان بھی خالی کردیا تو اسلام کے دشمنوں نے اسی پلیٹ فارم سے اپنی طبیعت کے مطابق تاریخ اسلام مرتب کرکے دنیا کے ہر خطہ میں پھیلانے لگے۔ اور اسلام کو کمزور کرنے کے لئے بہت سارے ہتھکنڈے استعمال کرنے لگے۔''

لہٰذا ان ہی باتوں کے پیش نظر مولانا نے سیرت رسول ﷺ کے اہم گوشوں کو سلیس اور عام زبان میں پیش کیا۔ اس کتاب میں آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے لے کر ہجرت کے بعد تک کے حالات مختصر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب مفید اور کارآمد ہے اور آنحضرت ﷺ کے سوانحی گوشوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اور قاری کے ایمان کو پختہ اور منور بھی کرتی ہے۔

مولانا محمد ادریس رضوی نے اس کے بعد مختلف موضوعات پر ادبی، مذہبی، سماجی اور معاشرتی مضامین لکھے اور یہ مضامین ہندوستان کے مقتدر علمی وادبی رسالوں اور جریدوں میں شائع ہونے لگے۔ مولانا نے ابتداء ہی سے اپنی تحریروں میں اخلاقی قدروں، مذہبیت کے جذبہ کو عام کیا۔ اس کے علاوہ پاکیزگی اور صداقت کو اپنی تحریروں کا حصہ بناتے ہوئے پاکیزہ ذوقِ جمال کو پروان چڑھانے کی سعی کرتے رہے۔ مولانا نے ادب کی مختلف اصناف جیسے تنقید، تحقیق، تقریظ نگاری، تبصرہ نویسی، سفرنامے، انشاء پردازی اور شاعری وغیرہ اصناف ادب پر طبع آزمائی کی

ہے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ اچھے شاعر ہیں کہ ادیب یا ایک اچھے خطیب۔ غرض مولانا کی شاعری اور نثر نگاری کو سمجھنے کے لئے ان کی ہمہ پہلو شخصیت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوجاتا ہے۔

مولانا کی دیگر نثری تصانیف میں کنزالایمان اور امام احمد رضا (کوئز) (۲۰۰۹) کلام راہی اور صنائع و بدائع (۲۰۰۹) گلبرگہ سے حیدرآباد اور کنزالایمان اپنے مفسرین کی نظر میں شامل ہیں۔ آخرالذکر کتاب کا انگریزی میں ترجمہ مولانا اشتیاق احمد مصباحی نے کیا اور ملک العلماء لائبریری جامعہ اشرفیہ اعظم گڑھ نے اپریل ۲۰۱۱ء میں شائع کیا۔

کلامِ راہی اور صنائع و بدائع ایک علمی کتاب ہے جس میں نقدِ شعر کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ اس علمی کتاب میں مولانا نے غلام مرتضی راہی کے اشعار کو بنیاد بناتے ہوئے راہی صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اور راہی شناسی کی مثال قائم کی ہے۔ مولانا کو راہی صاحب سے شرفِ تلمذ بھی حاصل رہا ہے۔ زیر نظر تصنیف لطیف ''کلام راہی اور صنائع و بدائع'' تنقیدی روایت کی عمدہ مثال قرار دی جاسکتی ہے مولانا موصوف کی اس علمی کاوش پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر حمید اکبر ڈین فیکلٹی آف آرٹس وصدر شعبۂ اردو وفارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ رقم طراز ہیں:

> ''غلام مرتضی راہی کے کلام میں صنائع و بدائع تلاش کرنے اور ان کی شناخت کروانے کا کام اتنا آسان نہیں ہے اس کام کے لئے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ ذوق سلیم کی بھی ضرورت ہوتی ہے شاعر کے منشاء تک رسائی مشکل بھی ہے اور آسان بھی، شاعر کی استعداد علمی کے مطابق یا قاری یا شارح کی صلاحیت واستعداد نہ ہوتو تفہیم وترسیل مشکل ہوجاتی ہے ورنہ آسان۔ چنانچہ مولانا محمد ادریس رضوی کی اس اہم علمی کوشش کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف گوناگوں صلاحیت کے حامل ہیں کلام راہی اور صنائع و بدائع کی تلاش میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر انتہائی اہم کام انجام دیا ہے''۔

شعریات سے واقفیت ادب کے ہر باذوق قاری کے لیے ضروری ہے زیر تبصرہ کتاب انہی امور کی وضاحت پر مبنی ایک جامع اور مستند تصنیف ہے۔ جس میں صنائع و بدائع کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے غلام مرتضی راہی کی شاعری میں موجود فنی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے اس کتاب میں کوئی بیس لوازم شعری کو مولانا نے اپنی کتاب کا حصہ بنایا ہے ان شعری لوازم میں کچھ لوازم علم بیان اور کچھ علم بدیع کے تحت آتے ہیں۔ صنعتوں کی تشریحات میں قطعیت اور جامعیت کا خاص خیال رکھا گیا ہے ہر صنعت کا مطالعہ کرکے قاری مطمئن ہوجاتا ہے۔ غرض مولانا نے اپنے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور تجربے کے ذریعے نہایت اہم کتاب تصنیف کی ہے۔

مولانا کی نثری کتابوں میں ایک اور کتاب تجلیات قلم، امام احمد رضا فاونڈیشن کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر علمی، اور ادبی مضامین شامل ہیں۔ بیشتر مضامین اصلاح معاشرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے قلم بند کئے گئے ہیں۔ ''گلبرگہ سے حیدرآباد تک'' مولانا کی ایک اور تصنیف لطیف ہے جو امام احمد رضا فاؤنڈیشن کلیان کی جانب سے ۲۰۱۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب سفرنامہ کی طرح ہے جس میں مولانا نے قیام گلبرگہ اور حیدرآباد کے دوران یہاں کے اکابر بزرگ اور اہلِ قلم کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کئے

ہیں۔اس کتاب میں حضرت بندہ نواز بلند پرواز: صوفیہ کی نظر میں اور امام احمد رضا اور مولانا انوار اللہ فاروقی جیسی مقتدر ہستیوں کی علمی و مذہبی ہم آہنگی پر مضامین ملتے ہیں۔اس کے علاوہ مرقع انوار، انوار اللہ فاروقی، حیات، علمی و ادبی کارنامے اور جزیرے نامی کتابوں پر بھی مولانا نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مولانا کی نثری تحریروں کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صالح افکار و نظریات کے ذریعے آج کے زوال آمادہ معاشرہ کو پہلی سی رمق دینا چاہتے ہیں۔ جہاں صوفیہ کی تعلیمات پا کر انسان انسانیت کا پیکر بن جاتا ہے۔ان کا یہ مذہبی رجحان ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے قلم سے صالح ادب کو مترشح کر رہے ہیں جس سے سماج اور معاشرہ مساوات، باہمی ہمدردی، نیک نفسی، علم دوستی اور انسانی کمالات وصلاحیتوں سے مزین ہو سکے۔

جہاں تک مولانا کی شاعری کا تعلق ہے تو وہ تقدیسی شاعری کو اہمیت دیتے آئے ہیں۔ان کے شعری سفر میں نغماتِ بخشش (تضمین) (۲۰۰۲)، وسیلہ بخشش (حمد و نعت) (۲۰۰۵)، سبیل بخشش (تضمین) (۲۰۰۸) اور دیوان رضوی یعنی صدائے بخشش (۲۰۱۲) شامل ہیں۔

تضمین نگاری کو مشکل فن کہا جاتا ہے اردو میں اس کی قدیم روایت ملتی ہے۔اردو شعراء نے فارسی شاعروں کے کلام پر مصرعے لگا کر دادِ سخن حاصل کی ہے۔مولانا نے بھی اس جانب توجہ فرمائی اور معروف نعت گو شاعروں کے کلام پر دادِ سخن پائی ہے۔مولانا ادریس رضوی کی شاعری میں حضور ﷺ سے عقیدت اور بزرگوں سے الفت اور مدحت کا وصف ملتا ہے۔ان کی شاعری میں شعری حسن اور لطافت بھی موجود ہے۔ان کی شاعری صالح افکار، عشق کی وارفتگی اور فنی پختگی کا بین ثبوت فراہم کرتی ہے۔

مولانا کی ایک درجن شعری و نثری کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور دو درجن سے زیادہ کتابیں اشاعت کی منتظر ہیں۔ان کی ہر نئی کتاب معلومات کا خزینہ ہوتی ہے وہ ہر موضوع پر ماہرانہ اظہار خیال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔لہٰذا سیکڑوں مضامین اور کتابوں پر تبصرے اعتبار پا چکے ہیں۔مذہب و تہذیب کا جو تسلسل ان کی تحریروں میں ملتا ہے اس سے ان کے اخلاقی ورثے سے لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے۔ان کی ذہنی فکر اور تخلیقی شعور کے سرچشموں کا پتہ ان کی کتابیں پڑھنے سے لگایا جا سکتا ہے۔مولانا کی تحریریں ان کے مضبوط ارادے پر اعتماد کا پتہ دیتی ہیں۔عصری تقاضے، سماجی میلانات اور معاشرے کے سرد گرم پر ان کی اچھی اور گہری نظر ہے، وہ ایک پختہ فکر ادیب، اور شاعر ہیں اور ہر لحاظ سے کامیاب شخصیت کے مالک بھی۔انہوں نے سادگی کو اپنا شیوہ بنایا اور وہی سادگی ان کی تحریروں کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔ندرت، تازگی، مذہبی جمال اور انفرادیت ان کی تحریروں کی امتیازی خصوصیات ہیں۔اگر چہ فکر و نظر میں ادب اور مذہب کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے تاہم ان کے مزاج میں میانہ روی، اعتدال اور اعتماد پسندی بھی موجود ہے۔موصوف کا ادبی سفر مسلسل ربع صدی سے ارتقا پذیر ہے۔

مولانا ادریس رضوی اپنی تحریری جلوہ ریزیوں کے ساتھ ساتھ تقریر سے بھی متاثر کرتے ہیں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ خطیب کسی بھی قوم کے لئے کافی اہمیت کا حامل ہے اور جس قوم میں خطیب نہیں ہوتا وہ قوم گونگی ہوتی ہے۔مولانا جیسے ذی علم کو دیکھنے کے بعد اطمینان ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریر اور خطابت سے قوم کو ایک مثبت فکر دینے کی سعی فرما رہے ہیں

۔ان کی اس کوشش میں ان کے شب و روز کی سخت محنت بھی شامل ہے۔یقیناً اس کا ثمرہ انہیں حاصل ہوگا اللہ تعالیٰ، حضور اکرم ﷺ کے صدقے اور ان کے پیر طریقت کی دعاؤں سے ان کے قلم اور زبان میں مزید طاقت عطا فرمائے تا کہ ہمیں ان کے افکار و نظریات سے روشنی حاصل ہو سکے۔خدا برتر و بزرگ انہیں صحت و سلامتی کے ساتھ رکھے۔

آمین یارب العالمین۔

☆☆

مولانا محمد ادریس رضوی کی ادبی جہتیں

توفیق احسن برکاتی، ممبئی-09819433765

اردو زبان کی ابتدائی نشو و نما میں علما و صوفیا کا انمٹ کردار رہا ہے، امیر خسرو کی چو پائیاں، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی شاعری اور سید مخدوم اشرف سمنانی کے نثری نمونے ہمیں اس سلسلے میں ثبوت فراہم کرتے ہیں، یہ نمونے اگر چہ غیر واضح ہیں اور موجودہ عہد کی زبان اردو کی طرح غیر مبہم نہیں ہیں تاہم ان میں اردو کی جڑوں کی تلاش غلط نہیں ہے۔ محققین اردو اس بات پر متفق ہیں کہ اردو زبان کے ابتدائی نثری و شعری نمونے صوفیا و علما کے قلمی بیاضوں میں موجود ہیں، اگر چہ ان کے موضوعات خالص متصوفانہ افکار پر مشتمل تھے اور ان میں پند و نصیحت کے رموز جلوہ افروز تھے لیکن فارسی و عربی و سنسکرت کے ساتھ ان میں ہندوی الفاظ بھی ملتے ہیں۔اس میدان میں خطہ دکن کے صوفیا و علما کا رول کافی سے زیادہ ملتا ہے اور ان کی ادبی خدمات مسلم الثبوت ہیں۔ یہ سلسلہ شاعری سے شروع ہوتا ہے اور تحقیق، تنقید، تاریخ نویسی، وقائع نگاری اور داستان نگاری تک دراز نظر آتا ہے۔اردو زبان کے تشکیلی عہد اور دور عروج میں کئی ایسی بلند پایہ شخصیات کے ادبی کارنامے آج تک تاریخ میں اپنے نقوش مستحکم کیے ہوئے ہیں اور ان کی شعری حیثیت، تحقیقی مزاج، اخاذ ذہنیت، ادیبانہ کمال اور تنقیدی نکتہ نگاہ کی سراہنا کی جاتی ہے-شاعر، محقق، تاریخ نویس، تنقید نگار، وقائع نگار اور داستان طراز علما کی جماعت میں بہت زیادہ مل جائیں گے، ہاں بعد میں علما کی توجہ دینی و علمی موضوعات کی جانب زیادہ ہوگئی اور ان کی ادبی نگارشات ایک خاص نہج پر سامنے آنے لگیں اور مدارس اسلامیہ عربی و فارسی زبان کی فنی و اصولی بحثوں میں منہمک ہو گئے اور اردو سے ان کا رشتہ میڈیم کی حد تک باقی رہا، اگر چہ ان ادوار میں بھی بعض ایسے علما و ارباب قلم سامنے آئے جنھوں نے اردو زبان کے مختلف گوشوں کو اپنی قلمی مہارت سے منور کر رکھا تھا اور ان کی خدمات کا دائرہ شاعری، تحقیق، تاریخ اور دیگر اصناف ادب تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ مدارس آج بھی اردو کے فروغ میں برابر اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں اور ان درس گاہوں کی زبان اور طرز بیان بھی اردو ہی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ سو برسوں سے علما و ارباب افتا کی جانب سے لکھی گئی کتابیں اور فتاویٰ کی زبان بھی اردو ہے اور یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔اردو کے فروغ میں مدارس اسلامیہ اور ان سے وابستہ علما و اساتذہ کی کاوشیں تاریخ اردو ادب سے کبھی محو نہیں کی جا سکتیں، یہ تاریخی حقائق ہیں جنھیں قبول کیا جانا چاہیے۔آج بھی مدارس کے فاضلین اردو زبان و ادب سے گہرا یارانہ رکھتے ہیں اور ادب کے مختلف شعبوں سے وابستہ ہیں، ان کی تنقیدی بصیرت، تحقیقی اٹھان اور سخن فہمی کی داد دی جاتی ہے، وہ یونیورسٹی میں بھی ہیں اور کالج میں بھی، اردو ادبیات

کے اداروں سے بھی ان کی وابستگی ہے اور اردو اکادمیوں سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ لیکن انہیں صاحب قلم علما کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو شہروں میں مساجد کی امامت وخطابت کے منصب پر ہیں یا مدارس میں استاذ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں یا کسی جریدے کی ادارت سنبھال رہے ہیں، ان کی جانب ارباب ادب کی نگاہیں بہت کم اٹھتی ہیں ، حالاں کہ ان میں تاریخی وادبی شعور بھی موجود ہے، شعری وفنی لیاقتیں بھی ہیں ، وہ تحقیقی وتاریخی مزاج کے حامل بھی ہیں، ان کے اندر صحافت وادب کا کمال رقصاں ہے، وہ شاعر بھی ہیں، عروض داں بھی ، مصنف بھی ، تاریخ نویس اور مدیر بھی ، لیکن اردو دنیا ان کا ذکر نہ کے برابر کرتی ہے۔ ان کا کام ادبی طرز کا بھی اور مذہبی امور پر بھی ان کا قلم مسلسل بحث کرتا رہتا ہے، لیکن، افسوس!!!! یار لوگوں نے ادب اور مذہب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ رکھا ہے اور مذہبی ادب ان کی نگاہ میں جچتا ہی نہیں۔

کتاب زندگی:

مولانا محمد ادریس رضوی علما وارباب قلم کی اسی جماعت میں شامل ہیں جنھوں سے ابتدا سے اب تک اردو ادبیات کو اپنی فکری وفنی صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اور مختلف اصناف میں نثری وشعری نگارشات کا معتد بہ حصہ اپنے زنبیل علم میں محفوظ کیے ہوئے ہیں۔ مولانا محمد ادریس رضوی ایک عالم، حافظ، قاری، شاعر، ادیب اور کامیاب زود گو نثر نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کے سیال قلم نے اتنی برق رفتاری سے نثر و نظم کے مختلف محاذوں پر کامیابی کا نشان لگایا ہے۔ اب تک کی نثری وشعری تصانیف کی تعداد چوالیس سے متجاوز ہے، جن میں اُنیس کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ شاعری میں موصوف معروف غزل گو شاعر محترم غلام مرتضیٰ راہی فتح پوری سے شرف تلمذ رکھتے ہیں۔

۳ر محرم الحرام ۱۳۷۸ھ/۲۰ر جولائی ۱۹۵۸ء کو صوبۂ بہار میں دربھنگہ ضلع کے ایک گاؤں ''مدلمن'' میں جنمے مولانا محمد ادریس رضوی کی مذہبی تعلیم حفظ وقرأت قرآن اور عالمیت تک ہے اور عصری تعلیم کے لحاظ سے ایم اے کے سند یافتہ ہیں، مدرسہ ایجوکیشن عربی وفارسی بورڈ صوبہ بہار سے مولوی کا امتحان پاس کیا ہے اور اس کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا، تعلیم وتدریس جیسا سنجیدہ مشغلہ اپنایا۔ ۱۹۸۸ء سے باقاعدہ کلیان مہاراشٹر کی سنی جامع مسجد پتری پل میں امامت وخطابت کا منصب سنبھالے ہوئے ہیں۔ جنوری ۲۰۱۴ء میں ان کی امامت وخطابت جیسے نازک منصب پر انتہائی کامیابی کے ساتھ جلوہ افروز رہنے کا ۲۵ر سالہ جشن بھی منایا جا چکا ہے۔ اور ان کی قلمی، علمی، ادبی ولسانی خدمات پر انھیں ''امام احمد رضا ایوارڈ'' بھی تفویض کیا گیا ہے۔ مفتی اعظم ہند علامہ شاہ مفتی محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی قدس سرہ سے شرف بیعت رکھتے ہیں۔ لکھنا پڑھنا جنون کی حد تک ہے، شعر وشاعری، تصنیف وتالیف اور تبلیغ مذہب حق زندگی کا حاصل ہے۔ ان کی ۶۰ر سالہ زندگی علم وعمل سے عبارت ہے۔ ''ابھی تو میں جوان ہوں'' ان کی جولانی طبع کا اعلامیہ ہے، یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم ان کی فکر ونظر کا شناخت نامہ ہے، تحفظ عقیدہ اور ذوق عقیدت ان کی پہچان ہے، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں پر شفقت ان کا وطیرہ ہے۔ نظم ونثر کی مختلف اصناف پر انھیں قدرت حاصل ہے، نثر نگاری، شاعری، تحقیق، تنقید، تبصرہ نگاری، تذکرہ نویسی وغیرہ ، اور علم عروض کے رموز اسرار سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں۔

نثر نگاری:

مولانا محمد ادریس رضوی کی قلمی زندگی کا آغاز بیسوی صدی کی آٹھویں دہائی کے بعد مضمون نگاری سے ہوتا ہے۔ قرطاس وقلم کی باقاعدہ ہم رشتگی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۹۰ء میں ان کی پہلی کتاب ''ماہتاب رسالت کی جلوہ ریزیاں'' ۹۶ صفحات پر مشتمل غوثیہ پبلشر الہ آباد یوپی سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی، دسمبر ۲۰۰۹ء میں اس کا انگریزی ایڈیشن امام مصطفیٰ رضا سینٹر ڈربن ساؤتھ افریقہ سے سو صفحات میں چھپا اور پھر ۲۰۱۲ء میں سیرت فاؤنڈیشن گل برگہ نے اس کتاب کا تیسرا اڈیشن شائع کیا۔ موصوف کی اس کتاب میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان پوشیدہ گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو عام کتب سیرت میں نہیں ملتے۔ اس کا انگریزی اور اردو زبان میں کئی ہزار کی تعداد میں چھپنا اس کی اہمیت اور مقبولیت کی دلیل ہے۔ ان کی دیگر نثری کتب میں کنز الایمان اور امام احمد رضا (کوئز) (صفحات:۳۰۵) کلام راہی اور صنائع وبدائع (صفحات ۱۵۸) کنز الایمان اپنے مفسرین کی نظر میں (صفحات:۱۶) گلبرگہ سے حیدر آباد تک، (صفحات:۸۰) تجلیات قلم (صفحات:۲۰۸) گلستان رضا (صفحات:۱۷۶) امام احمد رضا کے مبلغین (صفحات:۱۴۴) حرم سے حرم تک (صفحات:۱۴۴) اور عالمی برادری کا وحشت ناک معاشرہ (صفحات:۱۴۴) جیسی اہم اور گراں قدر تصنیفات قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ کتابوں کا اشاعتی وقفہ ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۴ء کا درمیانی حصہ ہے۔ ابھی حالیہ دنوں میں ان کی دو کتابیں ''مطالعۂ معاشرت'' اور ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں'' غوث الوری اکیڈمی، کلیان سے علی الترتیب ۹۶ اور ۸۸ صفحات پر مشتمل چھپ کر منظر عام پر آئی ہیں۔ اول میں مشاہدہ ہے دوم میں تحقیق ہے اور یہ دونوں کتابیں انتہائی قابل مطالعہ اور فکر انگیز ہیں۔

''مطالعۂ معاشرت'' مولانا محمد ادریس رضوی کی پندرہویں تصنیف ہے۔ کتاب کا مرکزی موضوع اگر چہ مسلمانوں کے معاشرتی مسائل کے ارد گرد گھومتا ہے لیکن اس موضوع کی سیکڑوں ذیلی شاخیں فکر پاروں کی شکل میں ہمارے افکار وخیالات کو مہمیز کرتی ہیں۔ کڑے مشاہدے، عمیق مطالعے اور بھرپور تجزیے واحتساب پر مشتمل یہ چھوٹی چھوٹی تحریریں ہماری سوچوں میں ارتعاش پیدا کر دیتی ہیں۔ اکثر تحریروں میں آغاز بیانیہ رنگ میں ہے جو آہستہ آہستہ تجزیہ اور تفکر کی سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے اور نقطۂ انتہا بالکل حیرت انگیز اور سبق آموز صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر منظور احمد دکنی فاضل مصنف کے فکر وشعور کی پختگی کی وضاحت یوں کرتے ہیں: ''مولانا (محمد ادریس رضوی) کی تحریریں ان کے مضبوط ارادے پر اعتماد کا پتہ دیتی ہیں، عصری تقاضے، سماجی میلانات اور معاشرے کے سرد وگرم پر ان کی اچھی اور گہری نظر ہے۔''

شاعری:

مولانا ادریس رضوی کے ایک مضمون کو پڑھ کر منفرد لب ولہجے کے غزل گو شاعر غلام مرتضیٰ راہی فتح پوری نے شعر گوئی کی طرف ان کی توجہ دلائی اور کہا کہ آپ میں شعر فہمی کی صلاحیت ہے لہٰذا شاعری شروع کر دیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۹۸ء سے انھوں نے باقاعدہ شاعری کا آغاز کر دیا اور یہ کام اتنے منظم انداز میں کیا کہ اس میدان میں مسلسل اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑنے شروع کر دیے۔ یہ سلسلہ تا حال قائم ہے اور ان کی فکر وفن کا آفتاب مزید آب وتاب میں ہے۔ پہلا تضمینی مجموعہ ''نغمات بخشش'' (صفحات ۹۶) ۲۰۰۲ء میں غوث الوریٰ اکیڈمی کلیان سے

شائع ہوا یہ آپ کی شاعری اور وہ بھی مشکل صنف تضمین نگاری کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اس کے بعد ۲۰۰۵ء میں وسیلۂ بخشش (حمد و مناجات کا مجموعہ) ۲۰۰۸ء میں سبیل بخشش (تضمینات کا مجموعہ) اور صدائے بخشش (دیوانِ رضوی) جولائی ۲۰۱۲ء میں ۲۳۲ صفحات پر مشتمل مجلد شائع ہوا ہے۔

مضمون طویل نہ ہو جائے اس لیے ہم نمونے پیش کرنے سے قاصر ہیں، ارباب کمال براہ راست ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے اپنی تنقیدی آرا پیش کر سکتے ہیں- ہاں قارئین کو یہ خوش خبری ضرور دیں گے کہ شاعرِ محترم کے (۳۱۴) رباعیات کا مجموعہ بہت جلد طبع ہونے والا ہے جو ان کے ادبی سفر کا سنگ میل ثابت ہوگا اور ادبی دنیا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھے گی-

عروض دانی:

مولانا محمد ادریس رضوی محض شاعر نہیں ہیں، وہ ایک ماہر عروض داں بھی ہیں، علم بیان، معانی، بدیع پر ان کی گہری نگاہ ہے، جس کا ثبوت بھی انھوں نے فراہم کر دیا ہے، جس وقت وہ اپنا نعتیہ دیوان مرتب کر رہے تھے تو اس میں یہ امتیاز بھی رکھا تھا کہ ہر کلام کے سرنامے پر ان بحروں کی نشان دہی بھی کر دی تھی جن پر وہ اشعار تحریر کیے تھے لیکن استاذ سخن غلام مرتضیٰ راہی کے ایما پر انھوں نے انھیں حذف کر دیا تھا۔ علم بیان و بدیع میں ان کی مہارت کا ثبوت ان کی تاریخی کتاب ''کلام راہی اور صنائع و بدائع'' (صفحات: ۱۵۸) کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی فن پارے کو فن کی میزان پر تولنا اور ان میں پوشیدہ صنائع و بدائع کی تلاش بڑا مشکل کام ہے بالخصوص ایسے دور میں جب وہ علم و فن رُو بہ زوال ہو اور اس فن کی ماہر شخصیات خال خال نظر آتی ہوں، شاعری کا عصری منظر نامہ بڑا دلکش اور حوصلہ افزا ہے، غزل، نظم، رباعی، مرثیہ، مثنوی، ہائیکو، تکونی، کہہ مکرنیاں وغیرہا اصناف سخن پر وافر شعری سرمایہ ہمارے درمیان موجود ہے۔ زبان و ادب پر تنقید بھی ارتقائی سفر طے کر رہی ہے، لیکن زبان و بیان کی وہ خوبی جو صنائع و بدائع سے عبارت ہے شعری نقد و ادب میں اس نوع کا تجزیاتی مطالعہ بہت کم ہے، اس تناظر میں ''کلام راہی اور صنائع و بدائع'' خاصے کی چیز ہے، بقول ڈاکٹر وحید انجم: ''کلام راہی اور صنائع و بدائع'' موضوع اور مواد کے اعتبار سے منفرد ہے، اس طرح کی کتابیں میری نظر سے بہت کم گزری ہیں، دورِ حاضر میں ایسی کتابوں کا چلن مفقود ہو رہا ہے، ایسی کتابیں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں-'' اور ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کے الفاظ میں: ''محمد ادریس رضوی نے البتہ ان تمام جہات سے ہٹ کر ایک نئے اور انوکھے انداز میں اردو کے ممتاز شاعر غلام مرتضیٰ راہؔی کے شعری کلام کا تجزیہ کیا ہے۔ اردو کے شعری نقد و ادب میں اس نوع کا یہ گویا اولین تجزیہ ہے-'' اس کتاب پر کئی ادبی رسائل نے گراں قدر تبصرے شائع کیے ہیں اور اس کے امتیاز کی سراہنا کی ہے۔

مولانا محمد ادریس رضوی نے مختلف مجلّات کے خصوصی شماروں کے لیے جو مقالات تحریر کیے ہیں ان میں بھی کئی ایسے ہیں جن میں کسی شاعر کی شاعری کا ہیئتی، فنی، عروضی اور بدیعی مطالعہ و تجزیہ کیا گیا ہے، ان مقالات و مضامین کی تعداد اڑسٹھ (۶۸) تک پہنچ چکی ہے اور ہند و پاک کے معروف جرائد میں انھیں شامل کیا گیا ہے۔

تحقیق و تجزیہ:

مولانا محمد ادریس رضوی اہل سنت کے جید عالم دین، سنجیدہ ادیب و شاعر ہیں، طبیعت اخاذ ہے، ذہن و فکر

میں وسعت ہے، قلم میں توانائی ہے، زبان و ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں، تحقیق و تدقیق کے دشوار گزار مراحل سے کامیاب گزر جانا ان کا عزم جنوں ہے، اس شعبے کو بھی ان کے قلم نے تشنہ نہیں چھوڑا۔ ''امام احمد رضا کے مبلغین'' نامی کتاب اس کا ثبوت ہے، یہ کتاب چودھویں صدی ہجری کی نامور علمی شخصیت، عرب و عجم میں یکساں مقبول فقید المثال فقیہ اور ممتاز نعت گو شاعر امام احمد رضا قادری قدس سرہ کے ان خلفا و تلامذہ کا تذکرہ ہے جنھوں نے عالمی سطح پر دین حق کی آواز بلند کی اور اشاعت علم کی حصہ داری قبول کی۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۰۸ حوالہ جات سے مزین ہے، جس میں مصنف کا محققانہ نکتہ نظر اور ادیبانہ کمال عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ماں'' بھی ایک عمدہ تحقیقی کتاب ہے جس میں والدہ نبی حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب اور ان کی ایمانی و عرفانی ذات کو تحقیقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ''عالمی برادری کا وحشت ناک معاشرہ'' (صفحات: ۱۵۲- اشاعت: جنوری ۲۰۱۴ء) میں ان کی دانش وری اور مسائل کے تجزیے کا دھنک رنگ نکھر کر سامنے آیا ہے۔

مصنف کی یہ کاوش کئی برسوں کی محنت شاقہ، اخبار بینی اور مطالعہ و مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ حوالہ جات کی طویل فہرست میں ہند و پاک کے مشہور اخبارات و جرائد کے تراشوں اور کتب کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ مصنف نے ذاتی مطالعے اور گہرے تفکر و دانش وری کے بعد ان بحثوں کو قلم بند کیا ہے۔ ''کنز الایمان اور امام احمد رضا'' بھی ایک عمدہ تحقیقی کتاب ہے، جو دراصل کنز الایمان کوئیز ہے جس میں امام احمد رضا کی زندگی، شخصیت، تصنیف و تالیف اور متعلقہ اُمور کے بے شمار جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور کنز الایمان کے دوسری زبانوں میں تراجم پر بھی سوالات و جوابات کی شکل میں کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر اس کتاب میں ساٹھ سے زائد ابواب متعین کیے گئے ہیں۔ سوانحی خاکہ سے متعلق ۵۰ سوالات، اسفار حج میں ۵۵ سوالات، سورتوں، آیات و رکوع پر مشتمل ۲۳۵ سوالات، دوسری زبانوں میں کنز الایمان کے تراجم پر ۴۰ سوالات، دیگر تصنیفات سے متعلق ۳۴۴ سوالات اور مجموعی طور پر ۱۹۱۷ سوالات اور ان کے شافی و کافی مستند جوابات اس کتاب کی زینت ہیں۔ ۳۰۴ صفحات پر مشتمل یہ مجلد کتاب ۲۸۵ حوالہ جات کی روشنی میں کنز الایمان اور دیگر اُمور سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے، جو عوام و خواص ہر ایک کے لیے یکساں مفید ہے۔

صحافت:

یہ ادبی دنیا کا المیہ ہے اور انتہائی افسوس ناک پہلو ہے کہ صحافت کے تاریخ نویسوں نے شعوری طور پر مذہبی مجلّاتی و اخباری صحافت کو نظر انداز کیا ہے، صرف چند رسائل و اخبار کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی تشنہ تشنہ، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ جرائد بھی زبان و ادب کے خدمت گار ہیں اور ان میں بھی علمی، لسانی، ادبی، شعری، فنی ابحاث پر مشتمل مضامین شائع کیے جاتے ہیں، تاریخی، تذکراتی، تنقیدی، تحقیقی موضوعات بھی زیر بحث آتے ہیں، ادبی مسائل کا تجزیہ ہوتا ہے، شعری حصے بھی ہوتے ہیں، اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں ادبی مورخین ان پر توجہ نہیں دیتے، شاید ان کی نگاہ میں یہ زبان و ادب کی خدمت نہیں ہے، محض خانہ پری ہے-

غوث الوریٰ اکیڈمی، کلیان کے زیر اہتمام ۱۹۹۹ء میں ایک سہ ماہی جریدہ ''لطافت'' کے نام سے جاری کیا گیا۔ یہ جریدہ مولانا محمد ادریس رضوی کی ادارت میں شائع ہوا جس کا پہلا اور آخری شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۹۹ء میں

منظر عام پر آسکا اور پھر ناگزیر وجوہات کی بنیاد پر اس کی اشاعت موقوف ہوگئی۔ ۵۶ صفحات پر مشتمل یہ خاص شمارہ خواجہ غریب نواز نمبر کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ سہ ماہی لطافت کلیان کے بند ہوجانے کے بعد ۲۰۰۹ء میں اخبار کی شکل میں چار ورقی ماہ نامہ ''المختار'' جاری ہوا، اس کے مدیر محمد ادریس رضوی کو منتخب کیا گیا، جس کے صرف تین شمارے منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد ماہ نامہ کو سہ ماہی کر دیا گیا۔ ۶۴ صفحات کے اس رسالے کی قیمت فی شمارہ ۱۵ روپے اور زر سالانہ ۱۵۰ روپے ہے۔ کئی شماروں کے بعد اس جریدے نے امام علم وفن علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی علیہ الرحمہ کی بلند پایہ شخصیت اور دینی وعلمی خدمات پر مشتمل ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ صفحات کل ۶۱۸ ہیں۔ فی الحال اس کی اشاعت موقوف ہے۔ ان رسائل کی ادارت کا فریضہ آپ نے بخوبی نبھایا ہے اور انھیں اپنی علمی وادبی عکوس سے مالا مال کیا ہے، جو ان کی صحافتی رنگ کو نمایاں کرتے ہیں۔ اب بھی مولانا محمد ادریس رضوی تھکے نہیں ہیں ،ان کا قلم مسلسل نئی نئی فتوحات پیش کر رہا ہے اور مذہبی وادبی دنیا ان کی علمی وفکری نگارشات سے استفادہ کر رہی ہے -مولانا محمد ادریس رضوی ''پیغام رضا'' ممبئی کے تین سال تک مدیر مسئول بھی رہے ہیں۔

دیوان رضوی میں الف تا یا کی ردیف

''ورفعنالک ذکرک'' کی جلوتوں اور بشارتوں میں نعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صدا قتیں اللہ عزوجل نے پیش فرمائی ہیں۔ صحابہ کرام کی پاکیزہ جماعت نے انہیں گرہ میں باندھ لیا اور سنت خدا پر عمل پیرا رہ کر مدحت پیغمبر اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انوار سمیٹتے رہے۔ یہ سچائیاں عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوئیں۔ صنف نعت نے ان زبانوں کے فن کو بھی متاثر کیا اور ادب کو بھی البتہ یہ ضرور ہوا کہ جو نعتیہ شاعری برائے فن کی گئی وہ دلوں سے محو ہوگئی اور جو شاعری برائے اظہار عشق آمد کے روپ میں جلوہ گر ہوئی عشاق کے دلوں میں آج بھی اس کے تازہ نقوش ملاحظ کیے جاسکتے ہیں۔ ہندوی زبان میں سب سے پہلے نعت گو شاعر کی تلاش خواجہ بندہ نواز گیسودراز علیہ الرحمہ کی شکل میں کی گئی ہے۔ نعتیہ شاعری کا یہ سلسلہ مشہور نعت گو شعرا سے ہوتا ہوا شہر بریلی پہنچ کر ایک دبستاں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عاشق صادق امام احمد رضا قادری قدس سرہ نے صفحہ قرطاس پر نعتیہ شاعری کے جو گل بوٹے کھلائے اور فن اور ادب کی جس اعلیٰ منزل پر پہنچ کر شاعری کی وہ کیف وکم ہر دو اعتبار سے بے مثال کہی جاسکتی ہے۔ شہر بریلی نے جس طرح فقہ وافتا اور تحقیق وتصنیف میں ایک دبستاں کا درجہ حاصل کیا تھا وہ نعتیہ شاعری اور اس کے مخصوص لب ولہجے کا بھی ایک دبستاں بن گیا۔ غزلیہ شاعری کی دنیا میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنو کو شہرت ملی اور نعتیہ شاعری میں دبستان بریلی کو۔ اس حقیقت کو پہچاننے کے لیے راقم کی کتاب ''خانوادہ رضویہ کی شعری وادبی خدمات'' مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی کا مطالعہ مفید ہوگا۔

دیوان رضوی حروف ہجائیہ کی ترتیب میں ایک ''دیوان'' کی حیثیت سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس دیوان سے قبل راقم الحروف، مشہور شاعر ونقاد ڈاکٹر صابر سنبھلی، محترم ڈاکٹر مشاہد رضوی، سید اولاد رسول قدسی اور محترم شاداب بدایونی کے نعتیہ، غزلیہ اور حمدیہ دیوانوں پر تبصرہ لکھ چکا ہے۔ زیر نظر تبصرہ دیوان رضوی کے آغاز میں دعائیہ کلمات (خواجہ مظفر حسین رضوی) منظوم تبصرہ (پروفیسر شاہ یوسف حسینی) تقریظ (پروفیسر مجید بیدار) دیباچہ (ڈاکٹر منظور احمد دکنی) کے بعد مولانا ادریس رضوی کے کلام پر علما، دانش وران، ارباب فکر اور ادبا کے خیالات وتاثرات

کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد محمد ادریس رضوی نے ''اپنی باتیں'' میں جن حقائق سے پردہ اٹھایا ہے وہ بڑے اہم اور قابل غور ہیں۔ ''دیوان کا معنی کیا ہے اور میرا کلام میری نظر میں'' جیسی دل چسپ اور قابل مطالعہ باتیں فاضل مصنف نے تحریر کی ہیں۔ اس تحریر میں تفصیلی طور پر تلمیذ داغ حسن رضا حسن بریلوی کے دو دیوانوں ''ذوق نعت (نعتیہ دیوان) اور ثمر فصاحت (غزلیہ دیوان) پر گفتگو مرتکز رکھی گئی ہے۔ زیر تبصرہ دیوانِ رضوی میں الف تا یا کی ردیف کی پابندی کرتے ہوئے کل ۲۴۶ کلام، ایک سلام، ۳۷ قطعات، اور ۲۳ رباعیات کو شامل کیا گیا ہے ۔ان کے علاوہ وسیلۂ بخشش سے پانچ کلام کو اس دیوان میں جگہ دی گئی ہے۔ موصوف کے کلام پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اصولوں کی شاعری ہے جس میں فن اور ادب کی بڑی مہارت اور باریک بینی سے برتا گیا ہے۔ جگہ جگہ یہ احساس بھی توانا رہتا ہے کہ موصوف نے دبستان بریلی سے کافی استفادہ کیا ہے۔ طویل بحریں بھی ہیں اور انتہائی چھوٹی بحر میں بھی نعت کہی گئی ہے۔ درد دل، عشق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ،اور ادب واحترام کی حسن کاری سے ایسے قیمتی ہیرے تراشے گئے ہیں کہ دل عش عش کرنے لگتا ہے۔ یہ تقدیسی شاعری ہے جسے مختلف ہیئتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ شدت روانی اور برجستگی دیدنی ہے، لفظیات کو بڑے احتیاط سے منتخب کیا گیا ہے۔ پروفیسر مجید بیدار صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد رقم طراز ہیں:

محمد ادریس رضوی کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بے جا تراکیب اور حسن کاری کے علاوہ شعری صنعتوں کے استعمال سے اجتناب برتتے ہوئے رواں اور عام الفاظ کے توسط سے ایسی نعتیہ شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مدحت رسول کے لیے خدا نے ان کی شعری لفظیات کو مختص کر دیا ہے اور جس روانی کے ساتھ وہ لفظوں میں کیفیت پیوست کرتے ہیں اس کی خصوصیت پر گو شاعروں میں بھی ملنی مشکل ہے۔'' (ص ۲۵)

کتاب کی ایک اور خصوصیت جس کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ ردیف الف مقصورہ کے تحت جو طویل حمد شامل کی گئی ہے اسی ایک کلام ہی میں الف یا یا کی ردیفوں کو استعمال کر کے قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے ۔یہ طویل حمد مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ہے جو کتاب کے صفحہ ۴۴ سے ۶۹ پر موجود ہے اور کافی متاثر کن ہے۔ مناجات کا ایک بند ملاحظہ کریں:

رنگ　اپنا　جہاں　سے　بنایا　جدا ٭
عشق　میں　تیرے　جلتا　رہوں　یاخدا
بندہ　در　پر　ترے　کر　رہا　ہے　ندا
اک　نظر　ڈال　دے　نکلے　دل　سے　صدا
یاخدا، یاخدا، یاخدا، یاخدا

حمد کے یہ اشعار بھی پڑھ لیں::

لعل و گہر کے حسن پر میری نگاہ جائے کیوں؟
ذہن میں تری لگا ہے دل دھیان کسی کا لائے کیوں؟

تیری رضا پہ میں رہوں ، تیری سخا پہ میں پلوں
کرتا رہوں یہی دعا ، کوئی مجھے چھڑائے کیوں؟

نعت کا ایک شعر:

نازاں ہے زمیں جن پہ وہ ذیشان ہیں یہ
تکتے ہیں سخی جن کو وہ سلطان ہیں یہ

قوی امید ہے کہ دیوان رضوی کا عشق ومحبت کے ایوان میں بھر پور خیر مقدم کیا جائے گا۔ مبارک باد۔☆☆☆☆

☆

نمونہ رباعیات

یہ بند پڑا قفل رہے گا کب تک   تو پردہ بنا نفس مرے گا کب تک
اک ضرب لگا دل پہ لگا رضوی تو   فریاد فغاں آہ کرے گا کب تک

(۲)

یہ دھوکا ریا مکر دغائیں کب تک   یہ گانجہ چرس بھنگ نشائیں کب تک
اے قومِ مسلمان بتادے تو ہی   ہم عیب ترے اتنے گنائیں کب تک

☆☆☆

منظوم تبصرہ ۔۔۔ بر دیوانِ رضوی

سید شاہ یوسف حسینی کاملؔ صاحب: صدر شعبہ عربی انجمن کونسل سائنس اینڈ کامرس کالج بیجاپور (کرناٹک)

یہ تبصرہ چونکہ منظوم ہے، مبصر اور شاعر کے کلام کا فرق بتانا ضروری ہے، اس لئے مبصر کے کلام سے پہلے ایک دائرہ میں مبصر اور شاعر کے کلام سے پہلے رضوی لکھ دیا گیا ہے، مبصر کا کلام صرف ایک بحر اور شاعر کا کلام مختلف بحروں پر مشتمل ہے۔

مبصر

خدا نام آغاز کرتا ہوں میں   رقم دل کی آواز کرتا ہوں میں
بفیضِ محمد رسولِ (ﷺ) خدا   یہ موقع مجھے اس طرح سے ملا
وہ منظور احمد کہ دکنی ہے جو   وہ آئے میرے ہاں بیجاپور کو
مجھے اک مسودہ لاکر دیا   بہ ایمائے رضوی انہوں نے کہا
لکھیں تبصرہ آپ اک مختصر   حقائق پہ دیوان کے ہو مختصر
رہیں کچھ دنوں چند مصروفیات   گذرتے رہے یونہی دن اور رات
پھر اک دن موبائل کی گھنٹی بجی   جو دیکھا تو تو آواز اکبر کی تھی

ملے مجھ سے وہ ان کے دیوان میں   ہوئی آشنائی بس اک آن میں
وہ شاعر ہیں عاشق ہیں عزت مآب   ہے دیوان ان کا بڑا لاجواب
لطائف کوائف سے معمور ہے   حقائق معارف سے پُرنور ہے
بڑی ہی سلاست سے طے کردیئے   فصاحت بلاغت کے سب مرحلے
ہراک صنعت میں ہیں طبع آزما   ہیں مستی سے گویا نبرد آزما
ہر اک بات قاری کو اپنی لگے   کہ دیوان رضوی تو فطری لگے
نمائش نہیں خود پسندی نہیں   کوئی شاعرانہ ہوس بھی نہیں
کہیں لن ترانی نہ کچھ لاغری   کہ آمد ہی آمد کی ہے شاعری
زبان وبیان پر ہیں قادر کلام   ہے رضوی کو میرے قلم کا سلام

رضوی

عشق پختہ ہوا   کام عمدہ ہوا
خشک آنکھیں ہوئیں   جام پیاسا ہوا
تیری محفل سے میں   اٹھ کے تنہا ہوا

مبصر

لکھی بات رضوی نے دل کی لگی   ملی جام و پھر مٹی تشنگی
ہوا عشق رضوی کا پختہ ہوا   بھری بزم میں بھی وہ تنہا ہوا

رضوی

عشق تو لاجواب ہے میرا   سب سے عمدہ یہ خواب ہے میرا
آپ سے میں کہاں مخاطب ہوں   اپنی جاں سے خطاب ہے میرا

مبصر

کوئی اور نظروں میں جچتا نہیں   محب غیر سے بات کرتا نہیں
کرے عشق اپنی ہی جاں سے خطاب   کہ رضوی نے لکھا ہے ایسا نصاب

رضوی

ہے سفر   سخت تر
کیا کرے   اب بشر
شوق ہے   موج پر
جاؤں میں   اب کدھر
میرے رب   رحم کر
کھول دے   اپنا در

سر رکھوں تیرے در

مبصر

اگر عبد ہے پھر تو معبود ہو / ہو قطرہ اگر تو سمندر بھی ہو
تڑپ سجدہ ءِ شوق میں گر جو ہو / جبیں کے لئے سنگ در بھی تو ہو

رضوی

نہ آپ آتے نہ بزم سجتی، نہ راز کھلتا، نہ راہ ملتی
نہ عشق ہوتا، نہ اشک بہتے، نہ نعت پڑھتا سنا سنا کر
نہ حمد ہوتی، نہ ذکر ہوتا، نہ جام پیتا، نہ مست ہوتا
نہ پھول کھلتے نہ گیت گاتا، زباں کو اپنی ہلا ہلا کر

مبصر

محمد ﷺ کی صورت سا کوئی کہاں / ازل سے ابد تک انہیں کا بیاں
انہیں کی وفا کو بنے دوجہاں / وہی بزم ہستی کے ہیں این و آں
خدا نے جو لولاک ان سے کہا / تو پھر راز تخلیق ہم پر کھلا

رضوی

فرش سے عرش پر / ایک پل کا سفر
سدرۃ المنتہٰی / آج ہے زیرِ پا
لامکاں تک گذر / آپ کی سربسر
خو خدا نے کہا / آفریں مصطفےٰ ﷺ
دیکھ مجھ کو ذرا / اب نہ پردہ رہا

مبصر

رُسل انبیاء ہیں سبھی معتبر / ہے معراج تنہا انہیں کا سفر
کسی نے نہ پایا وہ پایا مقام / علیہ الصلوٰۃ علیہ السّلام
ہراک آنکھ سے جوکہ چھپتا رہا / اُسی نے کہا آفریں مصطفےٰ ﷺ
کوئی تجھ سے پردہ نہ اب کچھ رہا / کہ آجا قریب اور میرے تو آ

رضوی

عدوئے محمد، محمد ﷺ کی عظمت پہ انگلی اٹھانے کی کوشش نہ کرنا
خدانے بنایاہے ان کو بڑا ان کی رفعت گھٹانے کی کوشش نہ کرنا
خیالوں کو بدلو سرابوں سے نکلو حقیقت سے اپنی نگاہیں نہ پھیرو
شفاعت کے مالک محمد ﷺ کو تم اپنے جیسا بتانے کی کوشش نہ کرنا

مبصر

جو ہستی میں ان کی کرے کسرِ شاں / وہ گستاخ ہی کی تو ہوگی زباں
ہے بے مثل بے شک وہ ذاتِ نبی ﷺ / کسی طرح کی بھی نہ تھی کچھ کمی
کیا رب نے محبوب جس ذات کو / تو کیا کچھ نہ دے گا وہ اُس ذات کو
بلندی کے تھے جس قدر بھی مقام / خدانے کئے بے گماں ان کے نام
جو رب کے خزانے میں تھیں نعمتیں / نچھاور کیا ان پہ سب عظمتیں
فضائل جو سب انبیاء کو دیئے / اُس اک ذات میں سب جمع کردیئے
نبوت عطا کی رسالت عطا کی / قیامت کی اُن کو شفاعت عطا کی
ہو کیسے بھلا ان کے جیسا کہیں / خدا نے جب اُن سا بنایا نہیں
بشر ہیں مگر سب سے افضل بشر / بزرگی میں بعدِ خدا معتبر
خدا بھیجتا ہے جب اُن پر سلام / کرے عظمتوں پر کوئی کیوں کلام

رضوی

تجھ کو کیسے بھول جائے تیرا بندہ اے حسین / ہو چکا ہے نام تیرا دل پہ کندہ اے حسین
خوب ہے دلکش ہے جامع دلربا سجدہ تیرا / اس سے بہتر اب نہ ہوگا کوئی سجدہ اے حسین

مبصر

شہیدوں کا ہے بے شک وہی ہے امام / حسین ابن حیدر پہ لاکھوں سلام
بچانے کو ناموسِ دینِ خدا / اکیلا وہ کربل کا رستہ چلا
جو دیکھا چمن کو جھلستا ہوا / وہ خونِ حلق کی نمی دے گیا
زمیں کی جبیں پر نشاں کر گیا / وہ اک سجدہ ایسا ادا کر گیا

مبصر

مضامین رضوی نے باندھے بہت / ہے دیوان ان کا مفصل بہت
کروں تبصرہ کیسے ہر بات پر / بیاں کردیا اس لئے مختصر
مبارک ہو رضوی کو دیوان یہ / کہ ان کے قلم کی ہے جولان یہ
دعا ہے یہ کامل کی میرے خدا / ہو رضوی کو لکھنے کا موقع عطا

☆☆☆

نمونہ کلام

غزل

بند آنکھوں سے بدن کی وادیاں دیکھا کئے / عشق و الفت، روح و دل کی شادیاں دیکھا کئے
حرص و لالچ بغض کی تیاریاں دیکھا کئے / خود میں خود سے، خود نئے ہم آندھیاں دیکھا کئے

رنج وغم دکھ درد کی سب جھاڑیاں دیکھا کئے
"ہم قفس میں رہ کے اپنا آشیاں دیکھا کئے"

موج و مستی، چھیڑ خوانی، کچھ نئی باتوں کی بھی
اپنے اندر بجتی ہوئی تالیاں دیکھا کئے

عقل و دانائی شعور و آگہی کی دوستو
لمحہ لمحہ ٹوٹی ہوئی جالیاں دیکھا کئے

جل گئی اپنی محبت کی یہاں فصلِ بہار
یادِ ماضی کی وہاں رَعنائیاں دیکھا کئے

جانِ جاں، جانِ وفا، جانِ محبت کو سلام
کہہ کے اپنی جان اس کی ایڑیاں دیکھا کئے

ابرِ الفت اوج پر، جانِ محبت ابر پر
آنکھ سے ہم اپنی ایسی سرفرازیاں دیکھا کئے

زلف و لب، رخسار پر اس کے فدا سارا جہاں
نفس کی ساری جو ہیں کمزوریاں دیکھا کئے

خشک لب، خاموش چہرہ، فکر میں ڈوبی ہوئی
جھولتی کانوں میں اس کی بالیاں دیکھا کئے

خامیاں ہی خامیاں ان کو نظر آئیں مگر
منہ پہ کہتے ہیں تمہاری خوبیاں دیکھا کئے

نور ونکہت جو کبھی ابلے ہیں اپنی ذات میں
آنکھ میں اپنی نئی بینائیاں دیکھا کئے

حسن جب گزرا کئے میری نظر کی راہ سے
حسن کو چھوڑا حسیں کی ایڑیاں دیکھا کئے

طالبِ دیدار کو اپنے بلایا طور پر
حسرتوں میں ڈوب کر ہم دوریاں دیکھا کئے

غم و رنج درد و الم بنکر نکلا لیلِ ونہار
خرمن ہستی پہ گرتی بجلیاں دیکھا کئے

کیا تمنا اَب کرے اوروں سے وہ رَضوی میاں
رحمتوں کی وہ ہری سب ڈالیاں دیکھا کئے

☆☆☆

کلام رضوی کی بدیعی پیمائش

محمد کاشف رضا شاد مصباحی ایم ،اے۔ایم فل،گلبرگہ-shaadmisbaahi@gmail.com

علامہ محمد ادریس رضوی نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں وہ دنیازدہ یا غیروں کی تہذیب کا دلدادہ نہیں تھا بلکہ مذہب ومذہبیات پر یقین رکھنے اور اسی پر عمل پیرائی کو کامیابی تصور کرنے والا گھرانہ تھا لہٰذا اسی خوبصورت اور دیندارانہ ماحول میں آپ کی نشونما ہوئی جب کچھ اخذ کرنے کی عمر ہوئی تو والدین نے اپنی اس بڑی اولاد کو آخرت کا سرمایہ کی شکل میں دیکھنے کی غرض سے دینی درسگاہ کے سپرد کردیا جہاں قال اللہ وقال الرسول کی صداؤوں اور باعمل اساتذہ کی تربیت اور ان کے مشفقانہ برتاؤ نے آپ کو اسلام کا مطلوب انسان بنادیا جب بظاہر حصول علم سے فارغ ہوئے تو خدمت دین متین کو اپنی زندگی کا حصہ بنایا اور قناعت پسندی کے ساتھ داعیانہ زندگی کو ترجیح دی اور منصب امامت وخطابت سے وابستہ ہوگئے۔اسی درمیان میسور یونیورسٹی سے ایم -اے اردو کیا۔آپ نے جہاں ایک طرف اپنی زبانی صلاحیتوں کو وعظ وخطاب کے ذریعہ دعوت وتبلیغ میں وقف کررکھا ہے وہیں قلمی میدان میں بھی آکر دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہے۔۱۹۹۸ء میں آپ کی تحریری صلاحیت ولیاقت سے متاثر ہوکر جناب غلام مرتضٰی راہی فتح پوری نے شاعری کرنے کا مشورہ دیا۔آپ نے ان کے مشورے کو قبول کیا اور انہی کی رہنمائی

میں شاعری کا آغاز کیا اور یہ ساری رہنمائی کا عمل خط وکتابت کے ذریعے ہوتا رہا اور آج جب کہ رضوی صاحب دیوان شاعر بن گئے تو بھی اصلاح اور مشورے کا سارا عمل خط وکتابت پر ہی موقوف ہے۔اور دونوں شخصیتوں کی ملاقات اب تک نہ ہوسکی آج کے اس برق رفتار سہولتوں سے آراستہ سواریوں کے دور میں ملاقات نہ ہو پانا تعجب کا باعث ضرور ہے لیکن مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ظاہری بات ہے کہ مذہبی ماحول میں جس کے شب وروز گزرے ہوں وہ اپنی شاعری میں تقدیسیت کو ہی ترجیح دے گا لہذا آپ نے اب تک کی اپنی شاعری کو تقدیسی شاعری کا ہی حصہ بنایا یا پھر اپنی شاعری میں صالح افکار ونظریات کو شامل رکھا - آپ کی شاعری جہاں حمد ونعت ومنقبت کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے وہیں آپ کی شاعری عروضی اعتبار سے فن کی کسوٹی پر کھری اترتی ہے۔آپ کی شاعری خودکلامی کا گہرہ نقش لیے ہوئی ہے آپ کی شاعری آپ کے درددل کی صدا ہے آپ خود لکھتے ہیں:

"یہ داخلی باتیں ہیں،میرے تخیل نے میری داخلی دنیا میں ہی جھانکا ہے اور جھانک کر، تیر کر،غوطہ لگا کر جو نکالا ہے اس کو نظم کی لڑی میں پرو دیا ہے" (دیوان رضوی)

آپ کے تخیل نے آپ کے اندرونی دنیا کو جو شعری جامہ پہنایا ہے وہ آپ کی شخصیت کا آئینہ ہونے کے ساتھ فنی لحاظ سے اپنے اندر ظاہری ومعنوی حسن کو بھی بڑے اچھوتے انداز میں لیے ہوئے ہے ہم نے اس مضمون میں آپ کی شاعری کی اسی ظاہری ومعنوی حسن یعنی بدائع معنوی اور صنائع لفظی کو دیکھنے کی طالب علمانہ کوشش کی ہے جس میں اختصار کو مکمل ملحوظ رکھا ہے۔اب تک آپ کے چار مجموعے کلام منظر عام پر آچکے ہیں ا۔نغمات بخشش تضمینی مجموعہ (۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۲ء)۲۔وسیلہ بخشش (۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۵ء)۳۔سبیل بخشش تضمینی مجموعہ(۱۴۲۹ھ مطابق ۲۰۰۸ء) ۴۔دیوان رضوی یعنی صدائے بخشش (۲۰۱۲ء)دیوانِ رباعیاتِ رضوی (غیر مطبوعہ) یہاں پر آپ کے دیوان سے بدائع معنوی کا جائزہ لیتے ہیں۔

صنعت طباق:

فن بلاغت کی معروف ودرسی کتاب ''دروس البلاغۃ'' میں اس صنعت کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ''هُوَ الْجَمْعُ بَيْنَ مَعْنَيَيْنِ مُتَقَابِلَيْنِ'' یعنی ایک کلام میں دو ایسے الفاظ کو جمع کرنا جس کے معنی متقابل ہوں۔اسی صنعت کو مطابقۃ اور تضاد اور تکافو بھی کہا جاتا ہے۔علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی (۶۶۶ھ-۷۳۷ھ) ''تلخیص المفتاح'' میں لکھتے ہیں ''هو ضربان :طباق الایجاب وطباق السلب'' یعنی طباق کی دوقسمیں ہیں طباق ایجابی اور طباق سلبی۔

طباق ایجابی: بلاغت کی مشہور کتاب ''جواہر البلاغۃ'' میں ہے "طباقُ الایجاب :هُوَ مَالَمْ يَخْتَلِفْ فِيهِ الضِّدَّان اِيْجَاباً وسَلْباً'' یعنی طباق ایجاب یہ ہے کہ جس میں ضدین ایجاب وسلب کے اعتبار سے مختلف نہ ہوں۔یعنی جس میں متضاد الفاظ لائیں جائیں جس میں حرف نفی لاحق نہ ہو۔جیسے۔جاگنا اور سونا۔

یہ تضاد کبھی دو اسموں کے درمیان ہوتا ہے جیسے کہ سورہ کہف کی آیت مبارکہ ہے وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ (سورہ کہف آیت ۱۸) اس میں ''ایقاظا'' (جاگنے والے)اور ''رقود'' (سونے والے)دونوں اسم ہیں اور معنی کے اعتبار سے متضاد ہیں اور ایک کلام یعنی اس آیت مبارکہ میں جمع ہیں۔کبھی دو فعلوں کے درمیان ہوتا ہے

جیسا کہ سورہ آل عمران کی آیت مبارکہ ۱۵۶ رمیں ہے "يُحْيِي وَيُمِيتُ" اس میں "يحيي" اور "يميت" دونوں فعل ہیں اور متضاد بایں معنی ہے کہ فرد واحد میں اگر چہ احیا و اماتت کا اجتماع ہوسکتا ہے لیکن بیک وقت دونوں کا اجتماع فرد واحد میں ممکن نہیں ہے لہذا اس معنی کر دونوں آپس میں متضاد ہیں اور ایک ہی کلام یعنی اس آیت میں جمع ہے ۔ کبھی دو حرفوں کے درمیان ہوتا ہے جیسے سورہ بقرہ کی آیت مبارکہ ۲۸۶ رمیں ہے "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" (**لھا**) کی حرف لام میں انتفاع والا معنی اور (**علیھا**) میں حرف علی میں تضرر والا معنی پایا جاتا ہے دونوں میں جہت معنی کے اعتبار سے تضاد پایا جاتا ہے اور ایک کلام یعنی اس آیت مبارکہ میں جمع ہے۔ کبھی ایک اسم اور ایک فعل کے درمیان ہوتا ہے۔ جیسے "اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ" (سورہ انعام آیت ۱۲۲) اس آیت کریمہ میں "**میتا**" جو کہ اسم ہے اور "فاحییناه" فعل ہے اور دونوں جہت معنی کے اعتبار سے متضاد ہیں اور ایک کلام یعنی اس آیت مبارکہ میں جمع ہیں۔ اب طباق کی ان تمام قسموں کا نمونہ حضرت رضوی کے کلام میں دیکھتے ہیں:

دو اسموں اور دو فعلوں کا تضاد:

دیکھا منظر قدرت کا ☆ خشک و تر کی مدت کا
بنتی بگڑتی عزت کا ☆ آتی جاتی علت کا

دوسرے مصرع میں "خشک وتر" کے درمیان اختلاف معنی طباق کو ظاہر کرتا ہے اور دونوں اسم ہیں اور تیسرے مصرع میں "بنتی بگڑتی" چوتھے مصرع میں "آتی جاتی" استعمال ہوئے ہیں یہ چاروں الفاظ فعل ہیں اور چاروں میں تضاد ظاہر ہے -

دو حرفوں کا تضاد:

چاہتا ہوں از زمیں تا آسماں
ہُو اَحد جاری صمد میرے مغیث

اس شعر کے مصرع اول کے حشو میں " از" اور "تا" میں طباق ہے۔ یہ دونوں حروف فارسی ہیں جس کا اردو میں معنی "سے" اور "تک" اور عربی "من" اور "اِلیٰ" ہے۔ "من" یعنی "سے" جو ابتدائے غایت کے لیے آتا ہے اور "اِلیٰ" یعنی "تک" جو انتہائے غایت پر دلالت کرتا ہے۔ جو آپس میں متضاد ہیں۔

ایک فعل اور ایک اسم کا تضاد:

کٹیں گے یا لٹیں گے کربلا میں آل احمد کے
سلامت تم بھی جاؤ گے نہ اب اپنی جبیں لے کر

اس شعر میں "کٹیں گے، لٹیں گے" جو کہ فعل ہے اس کے مقابل "سلامت" اسم ہے دونوں کے درمیان طباق والا معنی واضح ہے۔

طباق سلبی: جواہر البیان میں ہے "**وَهُوَ مَا اختلف فِيهِ الضِّدَّانِ اِيْجَاباً وَسَلْباً بِحَيْثُ يَجْمَعُ بَيْنَ فِعْلَيْنِ مِنْ مَصْدَرٍ وَاحِدٍ. اِحْدٰهُمَا مُثْبَت مرة ،الآخر منفى تارة اخرى فى كلام واحد**" یعنی الفاظ

متقابل ایجاب وسلب کے اعتبار سے مختلف ہوں اس طور پر کہ ایک ہی مصدر کے دو فعلوں کے درمیان جمع کیا جائے دونوں میں سے ایک مثبت اور اسی کا دوسری مرتبہ منفی استعمال کیا گیا ہو ایک ہی کلام میں ۔ جیسے کہ قرآن پاک کی یہ آیت مبارکہ "قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِينَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِينَ لَايَعْلَمُوْنَ" میں "يَعْلَمُوْنَ" اور "لَايَعْلَمُوْنَ" اثبات ونفی کے قبیل سے ہے اور ایک ہی مصدر سے ہیں۔ اب اسی کی روشنی میں حضرت رضوی کا شعر دیکھیں:

دنیا نہ بھولتی مجھ کو رضوی
دنیا کو کاش میں بھول جاتا

اس شعر کے پہلے مصرع میں "نہ بھولتی" اور دوسرے میں "بھول جاتا" دونوں کا مصدر بھولنا ہے لیکن ایک (نہ بھولتی) منفی اور دوسرا (بھول جاتا) مثبت ہے۔

صنعت مقابلہ:

دروس البلاغۃ میں اس صنعت کو صنعت طباق سے ہی شمار کرایا گیا ہے جبکہ اکثر مصنفین نے اسکو مستقل صنعت کے تحت ہی رکھا ہے۔ جواہر البلاغہ میں ہے "**ھی ان یوتی بمعنیین متوافقین اومعان متوافقة ثم یوتی بما یقابل ذلک علی الترتیب**" کہ اولاً دو یا زائد متوافق معنوں کو لایا جائے پھر اس کے مقابل معنی کو اسی ترتیب سے لایا جائے۔ مثال کے طور پر سورہ توبہ کی آیت مبارکہ ہے "فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا" اس آیت میں پہلے ضحک اور قلت کو لایا گیا پھر اس کے مقابل بکا اور کثرت کو ذکر کیا گیا یعنی ضحک کا مقابل بکا اور قلیل کا مقابل کثیر ہے اور ترتیب وار ہیں۔

اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں:

خوشی کم الم ہے بہت میرے دل میں
ہٹا دو یہ افتاد تم غوث اعظم

اس شعر کے مصرع اولی میں پہلے "خوشی کم" کو لایا گیا پھر اس کے مقابل "الم بہت" کو لایا گیا کہ "خوشی" کے مقابل "الم" ہے اور "کم" کے مقابل "بہت" ہے اور ترتیب وار ہے۔

بلاغت کی بعض کتابوں میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ متقابلین سے بعض مصرع اُولی میں ہو اور بعض مصرع ثانی میں ہوں۔ اس کا بھی نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

درد بھی تو دوا بھی تو ہی تو
ہر مرض کی مرے شفا ہے تو

اس شعر کے پہلے مصرع میں "درد" اور "دوا" لایا گیا پھر اس کے مقابل ترتیب وار دوسرے مصرع میں "مرض" اور "شفا" لایا گیا ہے۔

صنعت مراعاۃ النظیر:

ھی جمع امر ومایناسبه لا بالتضاد" (**دروس البلاغة**) چند ایسے امور کو یکجا کر دینا جس کے مابین تضاد کے سوا کوئی اور نسبت ہو۔ بحر الفصاحت میں ہے کہ اس کو تناسب اور توفیق اور ائتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں۔ کلام

میں ایسے دو یا اس سے زیادہ مناسب امور کا اجتماع ہوسکتا ہے۔ اس صنعت کو اس آیت کریمہ کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ صاحب جواہر البلاغہ نے دو مناسب امور کے اجتماع کی مثال میں اس آیت کریمہ "**ھُوَالسَّمِیْعُ الْبَصِیْر**" اور دو سے زائد کی مثال میں "**اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَۃَ بِالْھُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُم**" پیش کی ہے۔ پہلی مثال میں (سمیع اور بصیر) ایک دوسرے کے مناسب ہے جبکہ دوسری مثال میں (اشتروا) اور (ربحت) "تجارت" کے مناسب ہے۔

مراعات النظیر کو صنعت رعایت لفظی بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ صنعت ہے کہ ایک چیز کی مناسبت و رعایت سے کئی چیزوں کا تذکرہ کرنے کو مراعات النظیر کہتے ہیں، محمد ادریس رضوی اپنی تصنیف کلام راہی اور صنائع وبدائع میں مراعات النظیر کے مختلف حوالے پیش کئے ہیں، جو ذیل دیئے جاتے ہیں:

کلام میں کسی امر اور اس کے مناسب چیزوں کو جمع کرنا ہے۔ جن کے درمیان نسبت تضاد نہ ہو جیسے شاعر نے کہا ہے کہ:

اِذَاصَدَق التجدُّافتَریٰ العَمُّ لِلفَتی
مَکَارِمُ لا تَخفیٰ وَاِنْ کَذَبَ الخالُ

اس شعر میں شاعر نے جدّ، عم اور خال کو جمع کر دیا ہے۔ پہلے سے نصیبہ دوسرے سے عوام لناس اور تیسرے سے خیال مراد ہے (توضیح البلاغۃ)

جیسے غالب نے کہا:

رَو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پائے رکاب پر

اس شعر میں عمر کی تشبیہ گھوڑے سے دی ہے اور اسی مناسبت میں الفاظ۔ رخش، تھمے، باگ اور رکاب استعمال ہوئے ہیں (اسباق نمبر ۲۸ میسور یونیورسٹی میسور)

ایک چیز کی مناسبت اور رعایت سے کئی چیزوں کا ذکر کرنا، جیسے چمن کے بیان میں گل وبلبل و باغباں وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔

چشم بادام، دہن پستہ، زنخداں ہے سیب
کتنے پھل ایک نہال قد جاناں میں ہیں

یہاں (درخت) کی مناسبت اور رعایت سے میووں کا ذکر کیا گیا ہے۔

جبیں والفجر ہے، واللیل گیسوئے معنبر ہے
خطِ رُخ سورۂ یوسف ہے ان کے مصحفِ رخ کا
(خواجہ وزیر)

یہاں مصحفِ رُخ کی رعایت ومناسبت سے سورۂ والفجر، واللیل اور یوسف کا ذکر کیا گیا ہے۔
(اردو گرامر اور کمپوزیشن، سبط رضی)

انہیں مثالوں کی روشنی میں محمد ادریس رضوی کے کلام میں مراعات النظیر کو دیکھنا ہے کہ موصوف کے لئے اس صنعت میں کس قسم کے گل بوٹے ابھرے ہیں۔

جام و مینا مئے سُبو سب کچھ
اس عاشق کے نام کرنا ہے
دیوانِ رَضوی۔ صفحہ۔۲۰۱

عاشق کے نام کرنے کے لئے، عاشق کی مناسبت ورعایت سے میکدے کی مختلف چیزوں مثلاً جام، مینا، مئے اور سُبو چار چیزوں کے تذکرے ہیں۔

طاعت وبندگی وَ تقویٰ کی
حد پہ ہی صبح و شام کرنا ہے
دیوانِ رَضوی۔ صفحہ۔۲۰۱

حد کی مناسبت سے طاعت، بندگی اور تقویٰ کو لایا گیا ہے جو خوب ہے۔

ماہ وانجم زمیں پہاڑوں کو
اپنے اُوپر گواہ کرنا ہے
دیوانِ رَضوی۔ صفحہ۔۲۰۲

گواہی دینے کے لئے ایک شے کو گواہ نہیں بنایا گیا ہے بلکہ "گواہ" کی مناسبت ورعایت سے ماہ، انجم، زمیں اور پہاڑوں کو اکٹھا کیا گیا ہے، اسی لئے یہ مراعات النظیر ہے۔

ہر کلی اور پھول پتی سے
آج ہوگا حساب گلشن میں

گلشن کی مناسبت سے کلی، پھول، پتی کو اکٹھا کیا گیا ہے بلکہ یوں کہئے کہ گلشن کی مناسبت سے کلی، پھول، پتی اکٹھا ہوگئے ہیں، اس طرح سے رَضوی کے کلام کو دیکھا جائے تو مراعات النظیر کے بہت سارے اشعار اکٹھا کئے جاسکتے ہیں، یہاں پر تو صرف نمونہ پیش کرنا ہے۔

صنعت توریہ:

اس صنعت کو علمائے بلاغت ایہام، توجیہہ، تخییل، مغالطہ کا بھی نام دیتے ہیں علامہ جلال الدین محمد بن عبدالرحمن القزوینی نے تلخیص المفتاح میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "**ھی ان یطلق لفظ لہ معنیان ،قریب وبعید ویراد البعید**" کہ ایسا لفظ بولا جائے جس کے دو معنی ہوں ایک معنی قریبی اور دوسرا معنی بعیدی اور مراد اس لفظ سے بعیدی معنی ہی ہوں۔ علامہ قزوینی نے اس صنعت کو دو قسموں میں بانٹا ہے ا۔ مجردہ ۲۔ مرشحہ۔

مجردہ: **ھی التی لاتجامع شیئا مما یلائم القریب** . یعنی جس لفظ سے بعیدی معنی مراد لیے جارہے ہیں وہاں اس کے قریبی معنی کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً "**الرحمن علی العرش استویٰ**" (سورہ طٰہٰ ۵) اس آیت کریمہ

میں لفظ ''استویٰ'' بطور توریہ مستعمل ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ۱ر بلندی اور غلبہ کے ہیں۔ ۲راستقرار علیٰ الجسم۔ یہاں پہلا معنی بعید الفہم ہے اور یہی معنی مراد ہے جبکہ دوسرا معنی قریب الفہم ہے لیکن یہاں وہ معنی مراد نہیں ہے اور کیونکہ قریب الفہم معنی کے مناسب وملائم کوئی لفظ یہاں مذکور بھی نہیں ہے کہ اسی معنی کے مراد لینے پر اصرار کیا جائے کلام رضوی میں دیکھیں اس صنعت کو کس خوبصورتی کے ساتھ برتا گیا ہے۔

امید لگائے رضوی ہے
تیرے ہی سائے رضوی ہے

اس شعر میں لفظ ''سائے'' کا استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں ایک قریبی معنی جو دھوپ کی ضد ہے اور دوسرا بعیدی معنی حمایت ونصرت اور یہاں یہی بعیدی معنی یعنی حمایت ونصرت مراد ہے کیوں کہ قریبی معنی کے مناسبات یہاں مذکور نہیں ہیں۔

کہیں نہ پایا .خود میں پایا
اللہ اللہ کا رنگ چھایا

مذکورہ بالا شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''رنگ'' ہے، رنگ کا قریبی معنی ہے نیلا، زرد، سرخ وغیرہ، لیکن یہاں پر'' رنگ'' دُور کے معنی میں استعمال ہوا ہے، دُور کا معنیٰ انداز، طرز، روش، طاقت، قوت، مزہ، لطف، شغل ہے۔

صنعت عکس: الشیخ جلال الدین محمد بن عبدالرحمٰن القزوینی نے ''تلخیص المفتاح'' میں اور سید احمد ہاشمی نے ''جواہر البلاغۃ'' میں اور مرزا امجد رازی نے ''بدیع الرضافی مدح المصطفٰے'' میں اس صنعت کو محسنات معنویہ میں شمار کرایا ہے جبکہ'' دروس البلاغۃ'' میں اس صنعت کو محسنات لفظیہ میں شمار کرایا گیا ہے۔ دروس البلاغۃ میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے ''اَلْعَکْسُ هُوَ اَنْ یُقَدَّمَ جُزْءٌ فِي الكلامِ علیٰ آخرَ ثُمَّ یُعْکَسُ'' یعنی کلام میں ایک جز کو دوسرے پر مقدم کیا جائے پھر مقدم جز کو مؤخر اور مؤخر جز کو مقدم کر دیا جائے۔ عکس کی متعدد صورتیں ہیں ایک صورت یہ ہے کہ دو جملوں کے درمیان عکس کیا جائے۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں۔

جی کے مرنا ،مر کے جینا ہے کمال
عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے دھمال
درد تھا جان میں ،جان تھی درد میں
درد کا لطف جاں نے اٹھا تو لیا

پہلے شعر میں ''جی کے مرنا'' جملہ پلٹ کر ''مر کے جینا'' ہوگیا ہے۔ دوسرے شعر میں ''درد تھا جان میں'' معکوس ہو کر ''جان تھی درد میں'' بن گیا ہے۔

اس کی ایک صورت یہ ہے کہ تکرار دو لفظوں کے مابین ہو اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

پھر پھرا کر پھرا پھر ترے در پہ میں
عفو کی ہو شفاعت مرے رہنما

اس میں لفظ ''پھر پھرا'' الٹ کر ''پھرا پھر'' کی صورت اختیار کرلیا ہے، لہٰذا ان اشعار میں ''جی کے مرنا'' پلٹ کر ''مر کے جینا''۔ ''درد تھا جان میں''۔ ''جان تھی درد میں''۔ ''پھر پھرا''۔ ''پھرا پھر'' سے اچھے نقوش ابھرے ہیں۔

صنعت تلمیح:

دروس البلاغۃ میں ہے "التلمیح هو ان یشیر المتکلم فی کلامه الیٰ آیة اوحدیث اوشعر مشهور او مثل سائر اوقصة" یعنی تلمیح وہ ہے کہ متکلم اپنے کلام میں کسی آیت یا کسی حدیث یا کسی معروف شعر، کہاوت یا کسی معلوم قصے کی جانب اشارہ کرے۔ صنعت تلمیح کے اشعار کلام رضوی میں دیکھیں:

ناز کرتی زمیں ہے شہا آپ پر
فخر کرتا سما ہے سدا آپ پر
ختم مرسل کا قصہ ہوا آپ پر
خود خدا نے یہ قرآں میں فرما دیا

اس شعر کے تیسرے اور چوتھے مصرع میں سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۴۰ر مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّنَ وَ كَانَ اللهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا. (ترجمہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مَردوں میں کسی کے باپ نہیں۔ ہاں اللہ کے رسول ہیں۔ اور سب نبیوں کے پچھلے۔ اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ کی طرف اشارہ ہے جس میں حضور نبی کریم ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کا اعلان کیا گیا ہے۔

نار نمرود میں بھی جلنے کو
جاں سے حاضر خلیل ہے یارب
ہیں زمین اور آسماں شاہد
آگ میں عشق بے خطر گیا ہے

اس شعر میں حضرت ابرہیم علیہ السلام کے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل قرآن پاک میں مذکور ہے ''خزائن العرفان'' میں ہے کہ نمرود اور اس کی قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا ڈالنے پر متفق ہوگئی اور انہوں نے آپ کو ایک مکان میں قید کر دیا اور ''قریہ کوثی'' میں ایک عمارت بنائی اور ایک مہینہ تک بکوششِ تمام قسم قِسم کی لکڑیاں جمع کیں اور ایک عظیم آگ جلائی جس کی تپش سے ہوا میں پرواز کرنے والے پرندے جل جاتے تھے اور ایک منجنیق (گوپھن) کھڑی کی اور آپ کو باندھ کر اس میں رکھ کر آگ میں پھینکا، اس وقت آپ کی زبانِ مبارک پر تھا حَسْبِیَ اللهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ، جبریلِ امین نے آپ سے عرض کیا کہ کیا کچھ کام ہے؟ آپ نے فرمایا تم سے نہیں، جبرئیل نے عرض کیا تو اپنے ربّ سے سوال کیجئے! فرمایا سوال کرنے سے اس کا میرے حال کو جاننا میرے لئے کفایت کرتا ہے۔

کہنے لگا ستون نبی کے فراق میں
مت کیجئے جدا یہ دعا میرے سر کی ہے

اس شعر میں ستون حنانہ کے ایک ایمان افروز واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس کی تفصیل احادیث کی کتابوں میں مذکور ہے ہم یہاں ''سیرت مصطفیٰ'' کے حوالے سے نقل کرتے ہیں۔ ''مسجد نبوی میں پہلے منبر نہیں تھا، کھجور کے تنا کا ایک ستون تھا اسی سے ٹیک لگا کر آپ ﷺ خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ جب ایک انصاری عورت نے ایک منبر بنوا کر مسجد نبوی میں رکھا تو آپ ﷺ نے اس پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کر دیا ناگہاں اس ستون سے بچوں کی طرح رونے کی آواز آنے لگی اور بعض روایات میں آیا ہے کہ اونٹنیوں کی طرح بلبلانے کی آواز آئی۔ یہ راویانِ حدیث کے مختلف ذوق کی بنا پر رونے کی مختلف تشبیہیں ہیں راویوں کا مقصود یہ ہے کہ درد فراق سے بلبلا کر اور بے قرار ہو کر ستون زار زار رونے لگا اور بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ ستون اس قدر زور زور سے رونے لگا کہ قریب تھا کہ جوش گریہ سے پھٹ جائے اور اس رونے کی آواز کو مسجد نبوی کے تمام مصلیوں نے اپنے کانوں سے سنا۔ ستون کی گریہ وزاری کو سن کر حضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم منبر سے اتر کر آئے اور ستون پر تسکین دینے کے لئے اپنا مقدس ہاتھ رکھ دیا اور اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا تو وہ ستون اس طرح ہچکیاں لے لے کے رونے لگا جس طرح رونے والے بچے کو جب چپ کرایا جاتا ہے تو وہ ہچکیاں لے کر رونے لگتا ہے۔ بالآخر جب آپ نے ستون کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا تو وہ سکون پا کر خاموش ہو گیا اور آپ نے ارشاد فرمایا کہ ستون کا یہ رونا اس بنا پر تھا کہ یہ پہلے خدا کا ذکر سنتا تھا اب جو نہ سنا تو رونے لگا۔ (بخاری باب النجار۔ باب علامات النبوۃ)

اور حضرت بریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث میں یہ بھی وارد ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس ستون کو اپنے سینہ سے لگا کر یہ فرمایا کہ اے ستون! اگر تو چاہے تو میں تجھ کو پھر اسی باغ میں تیری پہلی جگہ پر پہنچا دوں تا کہ تو پہلے کی طرح ہرا بھرا درخت ہو جائے اور ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے اور اگر تیری خواہش ہو تو میں تجھ کو باغ بہشت کا ایک درخت بنا دینے کے لئے خدا سے دعا کر دوں تا کہ جنت میں خدا کے اولیاء تیرا پھل کھاتے رہیں۔ یہ سن کر ستون نے اتنی بلند آواز سے جواب دیا کہ آس پاس کے لوگوں نے بھی سن لیا، ستون کا جواب یہ تھا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) میری یہی تمنا ہے کہ میں جنت کا ایک درخت بنا دیا جاؤں تا کہ خدا کے اولیاء میرا پھل کھاتے رہیں اور مجھے حیات جاودانی مل جائے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ستون! میں نے تیری اس آرزو کو منظور کر لیا۔ پھر آپ نے سامعین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے لوگو! دیکھو اس ستون نے دار الفناء کی زندگی کو ٹھکرا کر دار البقا کی حیات کو اختیار کر لیا۔ (شفاء شریف۔ صفحہ ۲۰۰)

ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ستون کو اپنے سینہ سے لگا کر ارشاد فرمایا کہ مجھے اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ اگر میں اس ستون کو اپنے سینہ سے نہ چمٹاتا تو یہ قیامت تک روتا ہی رہتا۔

اس ستون کو دفن کرنے کے بارے میں علامہ زرقانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ نکتہ تحریر فرمایا ہے کہ اگر چہ یہ خشک لکڑی کا ایک ستون تھا مگر یہ درجات و مراتب میں ایک مرد مومن کے مثل قرار دیا گیا کیونکہ یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عشق و محبت میں رویا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ عشق و محبت کا برتاؤ یہ ایمان والوں ہی کا خاصہ ہے۔ (شفاء شریف صفحہ ۲۰۰۔ زرقانی جلد ۵ صفحہ ۱۳۸)

محسنات لفظیہ

جناس:

دروس البلاغۃ میں ''هو تشابه اللفظين في النطق لا في المعنى'' یعنی جناس یہ ہے کہ دو لفظ تکلم اور نطق میں ایک جیسے ہوں جب کہ معنی دونوں کے جدا ہوں۔ جناس اولاً دو قسموں میں بانٹا گیا ہے۔ (۱) تام۔ (۲) غیر تام

جناس تام مماثل: ایسے دو الفاظ جو حروف کی ہیئت، نوع، عدد، ترتیب میں یکساں ہوں اور دونوں اسم ہوں۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:۔

عشق میں رونا سونا ہے
سونا یہاں پہ سونا ہے

اس شعر کے مصرع اوّل میں ایک بار لفظ ''سونا'' اور مصرع ثانی میں دو مرتبہ لفظ ''سونا'' کا استعمال ہوا ہے تینوں لفظ سونا۔ سونا۔ سونا انواع حروف، تعداد حروف، ترتیب حروف، ہیأت حروف وغیرہ میں ایک ہی ہیں مگر معنی میں مغائر ہیں پہلا ''سونا'' بمعنی زر۔ طلا کے ہیں، دوسرا لفظ ''سونا'' نیند لینا، آنکھ لگنا، مرنا، ہمیشہ کے لیے آنکھ بند ہو جانے کے معنی میں ہے اور تیسرا لفظ ''سونا'' زر، طلا، ایک قسم کی مشہور دھات کے معنی میں ہے، یہاں پر لفظ ''سونا'' کا بہت عمدہ استعمال ہوا ہے، بلکہ شعر پڑھنے کے بعد کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

جناس تام مستوفی: ایسے دو الفاظ جو ہیئت، عدد، ترتیب میں یکساں ہوں لیکن نوعیت الگ الگ ہوں کہ ان دو میں سے ایک فعل اور دوسرا اسم ہو۔ اس کی مثال کلام رضوی میں دیکھیں:

خاک میں بستی ہے اک بستی
اسی میں تو ہے اپنی ہستی

اس شعر کے پہلے مصرع دو مرتبہ ''بستی'' کا استعمال ہوا ہے جو ہیئت، عدد حروف، ترتیب میں یکساں ہے لیکن نوعیت میں مختلف ہے کہ پہلا والا لفظ ''بستی'' فعل ہے جس کا مصدر بسنا ہے اور دوسرا لفظ ''بستی'' اسم ہے، جس کا معنی گاؤں، آبادی کے ہیں۔

غیر تام:

دروس البلاغۃ میں اس کی تعریف ان لفظوں میں کی گئی ہے ''ما اختلف في واحد من الاربعة المتقدمة'' یعنی جناس غیر تام وہ ہے کہ جس کے دو الفاظ کے حروف ہیئت، نوع، عدد، ترتیب میں سے کسی ایک میں اختلاف ہو اور باقی میں اتفاق ہو۔ اور اس کو چھ قسموں میں تقسیم فرمایا ہے۔ (۱) محرف۔ (۲) مطرف۔ (۳) مذیل۔ (۴) مضارع۔ (۵) لاحق۔ (۶) قلب۔

محرف: کلام میں ایسے دو لفظ کا لانا جو صرف ہیئت حروف یعنی حرکات و سکنات کے اعتبار سے مختلف ہوں۔ جیسے کہ عربی زبان کا مقولہ ہے ''جُبَّةُ الْبُرْدِ جُنَّةُ الْبَرْدِ'' یہاں بُرْد اور بَرْد میں صرف ''با'' پر پیش اور زبر کا فرق ہے باقی سب میں یکسانیت ہے۔ کلام رضوی میں اس کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا گیا ہے۔

ارماں ہے میں تجھ سے مِلتا
مِل کر تجھ سے آنکھیں مَلتا

اس شعر میں ''مِلتا'' اور ''مَلتا'' محل استشہاد ہے شعر کے پہلے مصرع میں ''مِلتا'' میم کے نیچے زیر اور دوسرے مصرع میں ''مَلتا'' میم پر زبر ہے یعنی میم پر زبر اور زیر کا فرق ہے باقی میں یکسانیت ہے۔

مطرف: وہ جناس غیر تام ہے کہ کلام کے اندر ایسے دو لفظوں کا استعمال کرنا جو تعداد اور حروف کے اعتبار سے مختلف ہو یعنی ایک کے بالمقابل دوسرے لفظ میں کوئی حرف زیادہ ہو اور یہ حرف کی زیادتی طرف اول (شروع) میں ہو کہ اس حرف کو اگر ساقط کر دیا جائے تو دونوں لفظ تعداد حروف میں مساوی ہو کر تجنیس تام کا فائدہ دیں۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں:

قاہر قادر قدیر ہے تو
سب کے سب کی تقدیر ہے تو

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''قدیر'' کا استعمال ہوا ہے اور دوسرے مصرع میں ''تقدیر'' کا استعمال ہوا ہے اگر ''تقدیر'' سے ''تا'' کو ساقط کر دیا جائے تو ''قدیر'' کی شکل اختیار کر جائے گا اور اس طرح جناس تام کا فائدہ حاصل ہوگا۔

مذیل: کلام میں ایسے دو لفظوں کا استعمال کرنا کہ ایک لفظ کے آخیر میں ایک حرف زائد ہو اگر اس حرف کو ساقط کر دیا جائے تو جناس تام کا فائدہ دے گا۔ اس کا نمونہ کلام رضوی سے:

خودی کی کمر خود سے توڑ
کہے گا اللہ ھو ہر جوڑ

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''خودی'' اور ''خود'' کا استعمال ہوا ہے ''خودی'' کے اخیر سے ''یا'' کو ساقط کر دیا جائے تو ''خود'' بن جائے گا۔

صاحب دروس البلاغہ نے درج کردہ اصطلاحات میں اس بات کا تذکرہ نہیں کیا ہے کہ اگر کلام میں ایسے دو الفاظ کا ذکر کیا جائے کہ ایک کے درمیان میں ایک حرف زائد ہو تو اسے کس خانہ میں رکھا جائے جبکہ صاحب جواہر البلاغۃ نے تینوں صورتوں کو بیان فرمایا اور ان کے نام اس طرح شمار کرائے ہیں۔ واختلافهما: يكون اما بزيادة حرف (في الاول) نحو :دوام الحال من المحال. او (في الاوسط) نحو: جدى جهدى. او (في الآخر) نحو :الهوى مطية الهوان. والاول يسمى (مردوفا) والثاني يسمى (مكتنفا) والثالث (مطرفا) اول اور ثالث صورتوں کی مثال کلام رضوی سے ہم نے پیش کر دی دوم کی نظیر کلام رضوی میں دیکھیں:

پھول اور پھل میں راز ہے تیرا
ہر پر میں انداز ہے تیرا

اس شعر کے پہلے مصرع میں پھول اور پھل کا استعمال ہوا ہے ''پھول'' کے درمیان سے حرف ''واؤ'' نکال دیا جائے تو ''پھل'' بن جاتا ہے۔

مضارع: دروس البلاغۃ میں ہے کہ '' اِن اختَلَفَا فِي حَرفَينِ غَيرِ مُتَبَاعِدَيِ المَخرَجِ '' کہ کلام میں ایسے دو

الفاظ کو جمع کرنا جس میں دو ایسے حرفوں کے مابین اختلاف ہو جو بعید المخرج نہ ہو۔ واضح رہے کہ اس قسم کا اختلاف الفاظ کے شروع میں بھی ہو سکتا ہے درمیان میں بھی ہو سکتا ہے اور اخیر میں بھی ہو سکتا ہے۔ اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

عقل جو ہوتی اپنی نافع
نفس کی خو کو کرتی دافع
کہتے ہیں ہم تو ہے رافع
کوئی نہیں ہے تو ہے شافع

اس شعر میں لفظ ''نافع'' اور ''دافع'' استعمال ہوا ہے جو تمام امور میں متحد و متفق ہے اور حرف اوّل (نون۔ دال) مختلف اور قریب المخرج ہے کیونکہ نون کا مخرج زبان کا کنارہ اور انیاب سے ثنایا تک مقابل کا تالو ہے جبکہ دال کا مخرج زبان کی نوک اور ثنایا علیا کی جڑیں ہیں اور یہ دونوں قریب المخرج ہیں۔

الف۔حا......ن۔د......د۔ط......ح۔ع......ل۔ر۔۔۔(قریب المخرج)
ب۔پ...........ج۔ش...........(متحد المخرج)

لاحق: دروس البلاغہ میں ہے ''وَ لَاحِق اِن تَبَاعَدَا '' یعنی لاحق یہ ہے کہ دو لفظ دو ایسے حرفوں میں مختلف ہوں کہ ان کا مخرج دور ہو۔ جیسے اِنَّهُ عَلىٰ ذٰلِكَ لَشَهِيدٌ وَاِنَّهُ لِحُبِّ الخَيرِ لَشَدِيدٌ' اس مثال شهيد اور شديد کے درمیان ''ہا'' اور ''دال'' کا فرق ہے اور ان کا مخرج دور ہے کہ ''ہا'' کا مخرج اقصائے حلق ہے اور دال کا مخرج زبان کی نوک اور ثنایا علیا کی جڑ ہے۔ کلام رضوی میں اس کا نمونہ دیکھیں

آسماں تا عرش و جنت فرش پر
ہر جگہ چرچا ہے آقا آپ کا

اس شعر میں دو لفظ ''عرش'' اور ''فرش'' کا استعمال ہوا ہے جن کے حرف اول میں اختلاف ہے اور دونوں حرف مختلف المخرج ہیں۔

صنعت قلب: دروس البلاغۃ میں ہے ''القلب هو كون اللفظ بحيث يقرأطرداوعكسا'' یعنی قلب لفظ کا اسطرح ہونا کہ اسے الٹا سیدھا دونوں طرح پڑھ سکیں اور اس الٹ پھیر سے عبارت و معنی میں کوئی فرق نہ آئے۔ صنعت قلب کی چند قسمیں ہیں۔

ا۔صنعت مقلوب کل: ''بحر الفصاحت'' میں ہے ''مقلوب کل یعنی سب حروف کلمے کے علی الترتیب منعکس ہوں جیسے خاک، کاخ وغیرہ۔ اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:۔

ڈھونڈھتا اپنے دل میں ہوں تجھ کو
مشغلہ یہ گلاب ہے میرا

اس شعر ''یہ'' کو پلٹ دیا جائے تو ''ہے'' بن جاتا ہے۔

میکدے میں شراب کی بارش
بزم ھو میں نصاب کی بارش

میرے ارمان و آرزو پر تو
کردے دلبر گلاب کی بارش

اس شعر میں لفظ ''شراب'' کو پلٹ دیں تو لفظ ''بارش'' بن جاتا ہے۔

۲۔صنعت مقلوب بعض: ''بحر الفصاحت'' میں ہے کہ مقلوب بعض اسے کہتے ہیں کہ کلمے کے بعض حروف ترتیب منعکس ہو جیسے قریب، رقیب۔ رشک، شکر۔ وغیرہ اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

تشنگی دید کی بڑھا میری
غیر کی یاد کا دیا لے جا

اس شعر میں لفظ ''یاد'' اور ''دیا'' میں مقلوب بعض کارفرما ہے کیوں کہ دونوں لفظوں کے مابین الف، دال، یا مشترک ہے۔

داغ دل کو مرے داغ دے عشق سے
داغ دل پہ نہ بیٹھے دغا کی طرح

اس شعر میں ''داغ'' اور ''دغا'' کے مابین مقلوب بعض کارفرما ہے کیوں کہ دونوں لفظوں کے اندر الف، دال، غین مشترک ہے۔

کر چکی دنیا ترے رضوی پہ وار
اب نہ کوئی پھر کرے یلغار اور

اس شعر کے پہلے مصرع میں ''وار'' مقلوب ہو کر شعر کے دوسرے مصرع میں ''اور'' بن گیا ہے یہی مقلوب بعض ہے۔

۳۔صنعت مقلوب مستوی: ''بحر الفصاحت'' میں ہے کہ ''مقلوب مستوی یعنی تمام لفظ یا فقرہ یا مصرع یا شعر مقلوب کرنے سے وہی لفظ یا فقرہ یا مصرع یا شعر حاصل ہو۔'' الفاظ میں اس طرح کے مقلوب کی مثال کلام رضوی میں ملاحظہ ہو!:۔

درد تھا جان میں ،جان تھی درد میں
درد کا لطف جاں نے اٹھا تو لیا

اس شعر میں تین بار لفظ ''درد'' کا استعمال ہوا ہے جسے قلب کیا جائے تو بھی درد پڑھا جائے گا جو شعر مین واقع ہے اور لفظ میں قلب ہے یہی صنعت مقلوب مستوی ہے۔

صنعت تجنیس خطی: بحر الفصاحت میں کہ تجنیس خطی یعنی دو لفظ متجانس بغیر رعایت نقاط و حرکات و انواع حروف کے مشابہ شکل میں واقع ہوں۔ جیسے خط اور حظ۔ غرق اور عرق۔ اردو ویب ڈاٹ کام کے ایک مضمون میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے ''وہ لفظ جو کتابت میں ہمشکل ہوں مگر تلفظ میں مختلف ہوں۔ جیسے شک اور سگ۔ کمان اور گمان وغیرہ''، تجنیس خطی کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:۔

جانتا درد دل کا مرے حال ہے
ہاتھ میں اپنے دنیا لیے جال ہے

اس شعر میں لفظ ''حال'' اور لفظ ''جال'' کتابت میں ہم شکل مگر تلفظ میں جدا ہے۔

مجھ سے ہوا نہ ہوگا تو جدا
تیری صفت یہی ہے اے خدا

اس شعر میں لفظ ''جدا'' لفظ ''خدا'' کا استعمال ہوا ہے جو کہ شعر میں بغیر رعایت نقاط ظاہر ہے۔ جو تلفظ میں جدا اور کتابت میں ہم شکل ہے۔

یقین ہے رضوی کو خلوت میں جلوت میں جان وتن میں
ہمیشہ تھا، ہے، رہے گا، بصر میں اللہ رہے گا

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو لفظ ''خلوت'' اور ''جلوت'' کا استعمال ہوا ہے اور دونوں مشابہ شکل ہیں۔

صنعت تکریر یا تکرار: صاحب جواہر البلاغہ نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے ''هُوَ ذِكْرُ الشَّيْءِ مَرَّتَيْنِ اَوْ اَكْثَرَ لِاَغْرَاضٍ'' یعنی کلام میں شئی کو دو یا زیادہ مرتبہ کسی غرض سے ذکر کرنا۔ تکرار کی چند صورتیں ہیں:

ا۔**تکریر مطلق:** اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شعر میں لفظ مکرر لائیں۔ اس کی چند صورتیں ہیں:

(ا) دونوں مصرع صرف تکرار پر مشتمل ہوں۔ کلام رضوی میں تکرار بڑے انوکھے انداز کے ملتے ہیں، پڑھنے والا جب پڑھتا ہے تو حیرت زدہ ہو کر عش عش کر اٹھتا ہے، قارئین بھی ملاحظہ فرمائیں:

آرزو، آرزو، آرزو، آرزو
توہی تو، توہی تو، توہی تو، توہی تو
آبرو، آبرو، آبرو، آبرو
میری تو، میری تو، میری تو، میری تو
روبرو، روبرو، روبرو، روبرو
گفتگو، گفتگو، گفتگو، گفتگو

یہ تینوں اشعار کا ہر مصرع مکمل تکرار پر مشتمل ہے ہاں پہلے دو اشعار میں پہلا مصرع تکرار بغیر الوسائط جب کہ دوسرا مصرع تکرار مع الوسائط پر مشتمل ہے جب کہ تیسرے کا دونوں مصرع تکرار بغیر الوسائط پر مشتمل ہے۔

(۲) لفظ کا تکرار دونوں مصرعوں کے اول میں ہو۔ نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

اوپر اوپر کمال کی دولت
نیچے نیچے زوال کی دولت

اس شعر کے مصرع اول میں ''اوپر'' اور مصرع ثانی میں ''نیچے'' مکرر استعمال ہوا ہے جو دونوں مصرعوں کے شروع میں ہے اور ایک ہی معنی پر دلالت کرتے ہیں۔

(۳) تکرار مصرع اول کے شروع میں ہو۔

چپکے چپکے کیا میں نے کیا کیا کیا
یار کو میرے وہ سب پتا ہو گیا

اس شعر کے پہلے مصرع کے شروع میں لفظ ''چپکے'' کی تکرار ہے اور یہی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

(۴) تکرار مصرع ثانی کے شروع میں ہو۔ کلام رضوی سے ایک رباعی کا شعر دیکھیں:

دل شاد مرا خوب کیا اس کا خط
نس نس میں بھرا خوب نشہ اس کا خط
الفاظ و جملہ تو گہر سے بڑھ کر
ہے میرے لیے تیر بلا اس کا خط

اس رباعی کے دوسرے شعر کے شروع میں لفظ ''نس'' کی تکرار ہے جو ایک ہی معنی پر دلالت کرتا ہے۔

(۵) تکرار دونوں مصرع کے آخر میں ہو۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

دیکھتی جان خواب ہے کیا کیا
روز لاتی عذاب ہے کیا کیا

☆

ذکر کر صبح و شام حق حق حق
عشق کا یہ ہے بام حق حق حق

☆

میں گنہگار اللہ اللہ
تو ستار اللہ اللہ

☆

مدینہ میں مجھ کو بلا چپکے چپکے
خدا بھاتی صورت دکھا چپکے چپکے

پہلے شعر کے دونوں مصرع کے آخر میں لفظ ''کیا'' اور دوسرے شعر کے دونوں مصرع کے آخر میں لفظ ''حق، حق، حق'' اور تیسرے شعر کے دونوں مصرع کے آخر میں لفظ ''اللہ'' اور چوتھے شعر کے دونوں مصرع میں لفظ ''چپکے'' کی تکرار ہے۔

(۶) پہلے مصرع کے آخر میں ہو۔

قلب و جگر مرے سدا، کہتے رہیں نبی نبی
یادِ نبی میں میں رہوں، ایسی ہی دھن لگا کہ یوں

اس شعر کے پہلے مصرع کے آخر میں لفظ ''نبی'' کی تکرار ہے۔

(۷) تکرار مصرع ثانی کے آخیر میں ہو۔

عشق میں جلنے مرنے کو رضوؔی
لیتا ہے تیرا نام حق حق حق

☆

میں جاؤں وہاں سے مدینے میں یارب
زمیں پر میں دیکھوں ارم چپکے چپکے

پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''حق'' کی تکرار ہے جب کہ دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ ''چپکے'' کی تکرا ہے۔

(۸) پہلے مصرع کے درمیان میں ہو۔

ہر ندا ہر ہر ادا میری نماز
تو جو چاہے ہو ابد میرے مغیث

اس شعر کے پہلے مصرع کے درمیان میں لفظ ''ہر'' کی تکرار ہے۔

(۹) دوسرے مصرع کے درمیان میں ہو۔

رحم و کرم کی فصل جدا ہو
لب پہ مرے ھوھو کی صدا ہو

اس شعر کے دوسرے مصرع کے درمیان میں لفظ ''ھو'' کی تکرار ہے۔

صنعت تضمین: تضمین یہ ہے کہ شاعر غیر کے کلام کو اپنے کلام میں شامل کرلے۔ تضمین میں غیر کے کلام کے ایک ٹکڑے کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے ایک مصرع کو بھی یا پورے کلام پر تضمین کی جاسکتی ہے۔ لیکن تغیر کثیر نہ ہو۔ جہاں تک رضوی کی تضمین نگاری کا معاملہ ہے تو ایک ماہر اور معروف تضمین نگار ہیں جس پر ان کا مجموعہ تضمین نگاری ''نغماتِ بخشش'' اور ''سبیل بخشش'' شاہد ہیں جس میں انہوں نے استاد شعرا مثلاً امام احمد رضا خان فاضل بریلوی، مفتی اعظم علامہ محمد مصطفےٰ رضا خان، علامہ عبدالعلیم آسی، علامہ حسن رضا خان علیہم الرحمہ کے مکمل کلام پر بڑی خوبصورت تضمین نگاری کی ہے۔ یہاں پر ہم ''سبیل بخشش'' نہیں بلکہ ''دیوان رضوی'' سے تضمین کے چند اشعار نقل کرتے ہیں۔

''مٹ گئے مٹتے ہیں مٹ جائیں گے اعدا تیرے''
حشر میں ہنستے ہوئے جائیں گے شیدا تیرے

☆

نظر میں ہے اب دین سے بڑھ کے دنیا
''یہ کیسی ہوائے مخالف چلی ہے''

☆

''جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں''
اس طرح صاف مجھے وہ نہ نظاروں میں ملیں

☆

نادان نہ سمجھا ہے نہ سمجھے گا انہیں
''ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ''

صنعت اقتباس: دروس البلاغہ میں ہے: ''الاقتباس: ''هُوَ اَن يُضَمَّنَ الكلامُ شَيْئًامِنَ القُرآن وَالْحَدِيْثِ لَاعَلٰى اَنَّه مِنْهُ'' یعنی اقتباس یہ ہے کہ کلام میں قرآن وحدیث میں سے کچھ حصہ اس انداز سے شامل کر لینا کہ پتہ نہ چلے کہ یہ قرآن اور حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جن لوگوں نے اقتباس کی تعریف یہ کی ہے ''کہ کلام کو آیت قرآنیہ وآحادیث سے مزین کرنا کہ اس سے کلام کی شان وشوکت میں زیادتی مقصود ہو'' یہ بہت عمدہ تعریف ہے اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں:

خود سے کیسے وہ احد ہے
سوچ کے عقل بھی بے سد ہے
وہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ہے
یہی سبب ہے کہ احد ہے

اس شعر میں (لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ) کے الفاظ قرآنی الفاظ ہے جو اس شعر میں سورۂ اخلاص سے اقتباس کیا گیا ہے جس نے شاعر کے نظریے (خدا کا خود سے ہونا، اس کا احد ہونا) کو مضبوطی، شان وشوکت اور قطعیت دے رہا ہے۔

جو دل میں جھانک کر دیکھا اسے پایا
کہ خود کو اَحْسَنِ تَقْوِيْم کی تفسیر ہی جانا

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اچھی صورت پر بنایا، قرآن مجید سورہ التین میں ''فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِيْم'' ہے، اس کی تفسیر میں علامہ احمد یار خان لکھتے ہیں ''پھر اسے انوکھی صورت بخشی، قامت سیدھی رکھی، صورت جمیل کہ جنات اور فرشتے بھی اس پر فریفتہ ہوتے ہیں، بلکہ اللہ کا محبوب بھی انسان ہی بنا (ﷺ) کھانے کے لئے ہاتھ دیئے، تاکہ کھانے کے آگے نہ جھکے، صرف رب کے آگے جھکے، ہر عضو مناسب بخشا تاکہ نہ ناک ہاتھی کی طرح لمبی، نہ پرندوں کی طرح غائب، جسم ایسا بخشا کہ اس قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ ساری عبادتیں ہوسکیں، دوسری مخلوق میں یہ نہیں'' یہ ہے ''فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِيْم'' کی تفسیر۔

واقعی میرے جان ودل سے تو
بڑھ کے حَبْلُ الْوَرِيْد ہے یارب

قرآن مجید کی آیت ''حَبْلُ الْوَرِيْد'' یعنی شہ رگ سے بھی قریب ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، بندہ اس آیت پر غور کرے تو وہ گناہوں سے کنارہ کش ہو جائے، کیوں کہ ہم کسی کو دیکھ کر گناہوں سے بھاگتے ہیں تو ہمارا خالق ومالک تو ہمہ وقت ہمارے روبرو رہتا ہے۔

جب بھی ہوتا ہے میرا دل مایوس
مژدہ لاتقنطو سناتا ہوں

☆

آتے ہی رب ھب لی نہ گایا کوئی
سجدۂ شکر کرتا نہ آیا کوئی

☆

مژدہ بخشش کا ایسا نہ لایا کوئی
شور برپا ہوا آگئے مصطفٰے

صنعت تنسیق الصفات: ''بحر الفصاحت'' میں ہے کہ صنعت تنسیق الصفات یعنی کسی چیز یا کسی شخص کا ذکر صفات متواترہ کے ساتھ کریں خواہ وہ صفات مدح کے ہوں یا مذمت کے کیونکہ صفت وہ چیز ہے جو کسی چیز کے ان معنی کو بیان کرے جو اس میں ہوں خواہ وہ معنی اچھے ہوں یا برے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صفت سے فقط خوبی ہی مراد ہوتی ہے بلکہ برائی ہو تو بھی صفت کہلائے گی۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں:

جمیل کہہ کر، کریم کہہ کر، رؤف کہہ کر، رحیم کہہ کر
پکارے گی ان کو ان کی امت صدا یہ چاروں جہات ہوگی

اس شعر کے پہلے مصرع میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ جمیل ۲۔ کریم ۳۔ رؤف ۴۔ رحیم

حبیب اکبر، نبی اکرم، طبیب افضل، امام مرسل
صدا سے پہلے، گدا کو دیتے ہیں لعل و گوہر اٹھا اٹھا کر

اس شعر میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ حبیب اکبر ۲۔ نبی اکرم ۳۔ طبیب افضل ۴۔ امام مرسل ۵۔ لعل وگوہر دینے والے

خدا کے دلبر، غریب پرور، ہمارے سرور، جہاں کے رہبر
دکھا رہے ہیں خدا کا رستہ، سبھی کو اپنا بنا بنا کر

اس شعر میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چھ صفات بیان کی گئی ہیں۔ ۱۔ خدا کے دلبر ۲۔ غریب پرور ۳۔ ہمارے سرور ۴۔ جہاں کے رہبر ۵۔ خدا کا رستہ دکھانے والے ۶۔ سبھی کو اپنا بنانے والے۔

صنعت سیاق الاعداد: جناب مرزا امجد رازی نے ''بدیع الرضافی مدح المصطفٰے'' میں صنعت سیاق الاعداد کی تعریف کے ضمن میں مختلف کتب کا حوالہ دے کر لکھتے ہیں: ''گویا صنعت سیاق الاعداد کی دو تعریفیں ہمارے سامنے ہیں۔

۱۔ کلام میں اسماء مفردہ کو ترتیب پر لانا۔
۲۔ کلام میں اعداد کو ذکر کرنا۔

گویا کہ کلام میں اسمائے مفردہ اور اعداد کا لانا صنعت سیاق الاعداد ہے اب اس کا نمونہ کلام رضوی میں ملاحظہ کریں:

قسم اول:

صدیق وعمر یہ ہیں وہ عثمان و علی
دیں جس سے عبارت ہے وہ دیوان ہیں یہ

اس شعر میں اسمائے مفردہ (ا)۔صدیق ۲۔عمر ۳۔عثمان ۴۔علی کو ترتیب کے ساتھ لایا گیا ہے خلافت کے اعتبار سے بھی اور وفات کے اعتبار سے بھی کیونکہ پہلے خلافت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ملی پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو ملی پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ملی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ملی اور وفات بھی اسی ترتیب سے ہوئی۔

قسم دوم:

مزے مزے کا ارمان دیا
اک دل اک سر دو کان دیا
ساٹھ فرشتے دربان دیا
ایک سے ایک نگہبان دیا

اس شعر میں (ا)(۲)اور(٦٠) کو ترتیب وار رکھا گیا ہے اور (ا) کا تکرار بھی ہے۔

صنعت اشتقاق: ''بحر الفصاحت'' میں ہے ''کلام میں ایک ماخذ اور ایک اصل کے چند لفظ لانا اس طرح کہ ان لفظوں میں اصل کے حروف ترتیب وار موجود ہوں اور اصل میں جو معنی ہیں ان میں بھی باہم وہ اتفاق رکھتے ہوں پس قمر اور رقم اس قبیل سے نہ ہونگے کیونکہ گو دونوں کلمے حروف میں متفق ہیں مگر ترتیب میں متفق نہیں ہیں''

جناب محبّ کوثر نے اپنی کتاب ''کلید سخن'' ص ۷۴ ر پر لکھا ہے۔صنعت اشتقاق: شعر میں ایسے لفظ کی اضافتین آئیں جن میں اصل لفظ کے حروف ترتیب کے ساتھ پائے جائیں۔ نیز معنی کے لحاظ سے بھی یہ الفاظ باہمی طور پر متفق ہوں۔

دن کٹا فریاد سے اور رات زاری میں کٹی
عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

''کٹا''، ''کٹی'' اور ''کٹے'' یہ الفاظ مصدر کٹنا سے مشتق ہیں لہٰذا یہ صنعت اشتقاق ہے۔

اس تعریف کا آخری حصہ کہ ''اصل کے حروف ترتیب وار موجو ہوں'' اگر ترتیب حروف سے مراد یہ ہے کہ علامت مصدر نکال دینے کے بعد بچ رہے کی ترتیب باقی رہے اور زائد معنی پیدا کرنے کے لیے لائے گئے زائد حروف اس ترتیب میں خلل نہ ڈالیں جیسا کہ محبّ کوثر صاحب کے پیش کردہ شعر میں ''کٹنا'' مصدر سے ''نا'' نکال دیں تو ''کٹ'' بچ جاتا اور کٹا، کٹی، کٹنے میں ترتیب حروف باقی ہے حالانکہ یہاں پر کٹا، کٹی ہر بار تذکیر و تانیث کے فرق کے ساتھ ماضی کے معنی میں مستعمل ہے یہ ترتیب حروف کی شرط فعل لازم میں تو درست مانا جا سکتا ہے لیکن اگر اسی کو فعل متعدی میں تبدیل کر دیا جائے تو ترتیب حروف کو باقی رکھنا ممکن نہ ہوگا بالخصوص جب کہ وہ سہ حرفی ہوں یا اس سے زائد حروف پر مشتمل ہوں۔خود صاحب ''بحر الفصاحت'' نے اس تعریف کے ضمن میں جس شعر کو

پیش کیا ہے وہاں بھی ترتیب حروف اصلیہ کو باقی نہیں رکھا جا سکا ہے۔انہوں نے درج ذیل شعر کو پیش کر کے مشتقات کی نشاندہی اس طرح کی ہے۔

اے بخت تو جاگ اور جگا ہم کو کہ پھر ہم
جاگیں گے نہ تا حشر جگائے سے کسو کے

جاگ اور جگا اور جاگینگے اور جگائے یہ چاروں لفظ جاگنا سے مشتق ہیں۔

اب دیکھیں کہ ''جاگنا'' سے علامت مصدر نکال دی جائے تو ''جاگ'' اور ''جاگینگے'' میں تو ترتیب حروف باقی ہے لیکن ''جگا'' اور ''جگائے'' میں نہیں حالانکہ اس کا مشتق منہ بھی ''جاگنا'' ہی ہے لہٰذا ترتیب حروف کی شرط چہ معنی دارد؟ اس صنعت کی تعریف و توضیح میں متعدد مقالے اور کتابیں نظروں سے گزریں جس میں ترتیب حروف کی شرط نہیں ہے بالخصوص مولانا اختر حسین فیضی، استاذ جامعہ اشرفیہ، مبارکپور۔زاہد نظر رضوی (ایم۔اے) کو لکا تا نے اپنے اپنے مقالے مشمولہ ''تجلیات تاج الشریعہ'' میں اور علامہ عبد الستار ہمدانی صاحب نے ''فن شاعری اور حسان الہند'' میں ''ترتیب حروف'' کی شرط نہیں لگائی ہے۔ایک دلچسپ بات کہ ڈاکٹر سراج احمد بستوی نے اپنے تحقیقی مقالے ''مولانا احمد رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری۔ایک تحقیقی مطالعہ'' (ص ۲۴۱) میں صنعت اشتقاق کی تعریف یوں کی ہے ''وہ صنعت ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو آپس میں ملتے جلتے ہوں لیکن ایک ماخذ نہ ہوں بظاہر ایک ماخذ سے معلوم ہوتے ہوں'' اس کی مثال میں امام احمد رضا فاضل بریلوی کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

مانگیں گے مانگے جائیں گے منہ مانگی پائیں گے
سرکار میں نہ ''لا'' ہے نہ حاجت ''اگر'' کی ہے

دراصل یہ صنعت شبہ اشتقاق کی تعریف ہے جسے انہوں نے صنعت اشتقاق میں درج کر دیا ہے۔
کلام رضوی میں اس کا نمونہ دیکھیں:

کون آ کر تجھے اٹھائے گا
قعر ذلت سے تو اٹھا خود کو

اس شعر میں ''اٹھائے گا'' اور ''اٹھا'' دونوں کا مشتق منہ ''اٹھانا'' ہے۔

چھوڑ کر بزم ہم نہ بھاگیں گے
بے وفا اب ترے بھگانے سے

اس شعر میں ''بھاگیں گے'' اور ''بھگانے'' دونوں کا مشتق منہ ''بھاگنا'' ہے۔

۴۔**صنعت مزدوج** (مکرر، مردد): ''بدیع الرضا فی مدح المصطفےٰ'' میں ہے کہ ''اگر کلام میں دو ایسے لفظ آ جائیں جو مقلوب بھی ہوں اور متقارب بھی ہوں اور ان میں سے کسی دوسرے لفظ سے فاصلہ نہ ہو سوائے حرف عطف یا حرف جر ان کی مثل کے۔اس کو مزدوج اس لیے کہتے ہیں کہ دونوں متوالی واقع ہوتے ہیں مکرر اس لیے کہتے ہیں کہ ایک دوسرے کی وجہ سے مکرر ہے اور مردد اس لیے کہتے ہیں کہ دوبارہ واقع ہوتے ہیں۔'' اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں۔

آنکھوں سے دیکھتا مدینہ
جینے کا اک شعار ملتا

اس شعر میں لفظ ''کا'' اور ''اک'' کے مابین صنعت مکرر واقع ہے اور دونوں کے مابین صنعت مقلوب کل بھی واقع ہے۔

قلم کے، نظم ثنا کے، نگہ کے، علم وعمل کے
وفا کے، مدحت کے سب کے اثر میں اللہ رہے گا

اس شعر میں لفظ علم اور عمل میں صنعت مکرر واقع ہے اور مقلوب بعض بھی کیوں کہ دونوں لفظوں کے مابین مقلوب بھی واقع ہے اور متقارب بھی ہیں اور دونوں لفظوں میں عین، لام، میم مشترک بھی ہے۔

۵۔صنعت مقلوب مجنح:
''بحر الفصاحت'' میں ہے کہ ''لفظ مجنح مشرف کے وزن پر مفعول کا صیغہ ہے اس کے معنی باز و دار کے ہیں اور اصطلاح میں اسے کہتے ہیں کہ الفاظ مقلوب میں سے ایک لفظ بیت کے اول میں واقع ہو اور دوسرا بیت کے آخر میں۔'' اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

یہ لاشعور میں حسیں شعور ہے
کہ لاشعور میں جدید طور ہے

اس شعر میں ''یہ'' بیت کے اول میں واقع ہے اور یہی مقلوب ہوکر ''ہے'' کی صورت میں بیت کے آخر میں ہے۔

یہ ہندستان میرے خواجہ کا ہے
دھن کا ایوان میرے خواجہ کا ہے
کہتی ہے مانتی ہے دنیا ساری
بٹتا عرفان میرے خواجہ کا ہے

اس شعر میں ''یہ'' بیت کے اول میں واقع ہے اور یہی مقلوب ہوکر ''ہے'' کی صورت میں بیت کے آخر میں ہے۔
صنعت تسجیع (رعایت سجع): دروس البلاغۃ میں ہے ''السجع: ھو توافق الفاصلتین نثرا فی الحروف الاخیر'' یعنی سجع: وہ نثر کے دو فاصلوں کا حرف اخیر میں موافق ہونا ہے۔'' یہ صنعت نثر کی طرح نظم میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس کی چند صورتیں ہیں:
ا۔سجع متوازی: یعنی فقرے کے آخیر میں ایسے دو الفاظ کا استعمال کرنا کہ دونوں وزن اور حرف آخیر میں متفق ہوں۔ جیسے المرء بعلمه وادابه لابحسبه ونسبه اس جملے میں لفظ حسبہ اور نسبہ وزن اور حرف آخر (ہ) میں یکساں ہے۔ اس مثال کی وضاحت میں ''بدیع الرضانی مدح المصطفے'' ہے ''ان کے وزن اور حرف آخر (ب) میں یکسانیت ہے'' جو سہو کتابت ہے کیونکہ لفظ ''حسبہ'' اور ''نسبہ'' میں آخری حرف (ہ) ہے نہ کہ (ب) ہے۔

زندگی موت قال کی صورت عیش وعشرت وبال کی دولت

میرے دل میں آئے تو مقصود آئے
تمنا ہے دل میں کہ مشہود آئے

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''صورت'' اور مصرع ثانی میں لفظ ''دولت'' اور دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''مقصود'' اور مصرع ثانی میں لفظ ''مشہود'' استعمال ہوا ہے جو وزن اور حرف آخر میں برابر ہیں۔
سجع مطرف: کلام کے آخیر میں ایسے دو الفاظ کا استعمال جو وزن میں تو متفق نہ ہوں لیکن حرف آخر میں متفق ہوں۔ جیسے الانسان بادابه لابزيه وثيابه اس جملے میں لفظ ''ادابہ'' اور ''ثیابہ'' اور ''بزیہ'' استعمال ہوئے ہیں جو وزن میں تو مختلف ہیں لیکن حرف (ہ) میں متفق ہیں۔

زندگی آر پار ہوتی ہے
خود سے خود پر نثار ہوتی ہے

☆

فرش سے عرش پر
ایک پل کا سفر

☆

مرتبہ آپ سا
کب کسی کو ملا

☆

دیکھ لے خلد بھی
حور و غلماں سبھی

پہلے شعر میں لفظ ''پار'' اور ''نثار'' وزن میں تو متفق نہیں ہیں لیکن حرف آخر (ر) میں متفق ہیں۔ دوسرے شعر میں لفظ ''پر'' اور ''سفر'' ہم وزن تو نہیں ہے لیکن حرف آخر (ر) میں متفق ہیں۔ تیسرے شعر میں لفظ ''سا'' اور ''ملا'' ایک وزن تو نہیں ہے لیکن حرف آخر (الف) میں متفق ہیں۔ چوتھے شعر میں لفظ ''بھی'' اور ''سبھی'' ہم وزن تو نہیں لیکن حرف آخر (ی) میں متفق ہیں۔
سجع موازنہ: کلام میں ایسے دو الفاظ کا استعمال جو وزن میں تو برابر ہوں مگر حرف آخر میں برابر نہ ہوں۔ جیسے وَنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ۔ اس آیت کریمہ میں دو لفظ مصفوفة اور مبثوثة وزن میں تو برابر ہے لیکن حرف آخر میں برابر نہیں اس لیے کہ مصفوفة میں حرف آخر (ف) ہے اور مبثوثة میں آخری حرف (ث) ہے۔ رہی بات یہ کہ دونوں الفاظ کے میں (ۃ) ہے تو اس کا اعتبار نہیں کیونکہ قافیہ میں تائے تانیث کا قافیہ میں کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

تم گلے ملتے نہیں دور سے کرتے ہو سلام
تم میں آ سکتا نہیں دین کی خوبی جمال

ہیں مبلغ و مقرر بھی بہت تم سے اداس
تم نہیں کرتے ذرا اپنے معالج کا خیال

پہلے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''سلام'' اور مصرع ثانی میں ''جمال'' استعمال ہوا ہے جو وزن میں تو متفق ہیں لیکن حرف آخر میں متفق نہیں ہیں کیوں کہ ''سلام'' کا آخری حرف (م) اور ''جمال'' کا آخری حرف (ل) ہے ۔دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''اداس'' اور ''خیال'' کا استعمال ہوا ہے جو ہم وزن تو ہیں لیکن حرف آخر میں متفق نہیں ہے کیوں کہ ''اداس'' کا آخری حرف (س) اور ''خیال'' کا آخری حرف (ل) ہے۔

سجع مماثلہ: اس کی صورت یہ ہے کہ شعر کے پہلے مصرع کے تمام یا اکثر الفاظ وزن میں دوسرے مصرع کے مثل ہوں ۔

غم زدوں کو غرور کیا ہوگا
بے کسوں کو سرور کیا ہوگا
مے پلا دل جلا
ہے دعا یا خدا

دونوں اشعار کے تمام الفاظ ایک دوسرے مصرع میں برابر ہیں یعنی متفق الوزن ہیں تمام الفاظ کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں رکھ کر اس طرح سمجھیں:

غم	زدوں	کو	غرور	کیا	ہوگا
بے	کسوں	کو	سرور	کیا	ہوگا

مے	پلا	دل	جلا
ہے	دعا	یا	خدا

صنعت مبادلۃ الرأسین: ''بحر الفصاحت'' میں ہے کہ ''مبادلۃ الرأسین یہ ہے کہ دو لفظوں میں حرف اول باہم تبدیل ہوں:

عشق و عرفاں کمال کی دولت
جان و دل پر جمال کی دولت

اس شعر کے پہلے مصرع میں لفظ ''کمال'' اور دوسرے مصرع میں لفظ ''جمال'' کا استعمال ہوا ہے جس کے آغاز حروف (ک) اور (ج) کا فرق ہے باقی میم، الف، لام میں متفق ہے۔

فرش سے عرش پر
ایک پل کا سفر

اس شعر کے پہلے مصرع میں دو الفاظ ''فرش'' اور ''عرش'' کا استعمال ہوا ہے جس کے پہلے حرف (ف) اور (ع) کا فرق ہے۔

صنعت تصدیر:

یہ صنعت نثر اور نظم دونوں میں جاری ہوتا ہے دروس البلاغۃ میں ہے ''التَّصْدِیْرُ: وَ یُسَمّیٰ رَدُّ العَجُزِ عَلیٰ الصَّدْرِ وَ فِیْ النَّظْمِ اَنْ یَکُوْنَ فِیْ آخِرِ البَیْتِ والآخِرُ فِیْ صَدْرِ المِصْرَاعِ الاَوَّلِ اَوْبَعْدَهُ'' تصدیر اس دوسرا نام ردالعجز علی الصدر بھی ہے اور تصدیر نظم میں یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ایک لفظ شعر کے اخیر میں ہو دوسرا پہلے مصرع کے شروع میں یا اس کے بعد ہو۔

تصدیر کی چار صورتیں ہیں (۱) صنعت رد عجز علی الصدر (۲) صنعت ردالعجز علی العروض (۳) صنعت ردالعجز علی الابتدا (۴) صنعت ردالعجز علی الحشو ۔

اب یہاں پر ۵ رچیزیں سمجھنے کی ہیں (۱) عجز (۲) صدر (۳) عروض (۴) ابتدا (۵) حشو۔ مولانا محمد احمد مصباحی سابق پرنسپل جامعہ اشرفیہ مبارک پور نے ''معین العروض والقوافی'' میں لکھا ہے کہ ''شعر دو مصرعوں پر منقسم ہوتا ہے ۔مصرع اول کو صدر ثانی کو عجز۔ صدر کے آخری جز کو عروض ۔عجز کے آخری جز کو ضرب ۔ بقیہ اجزا کو حشو کہا جاتا ہے '' ۔مصباحی صاحب کا مطلقاً مصرع اول کو صدر اور ثانی کو عجز کہنا اور پھر صدر کے آخری جز کو عروض اور پھر بقیہ اجزا کو حشو کہنا کا غیر درست ہے ۔کیونکہ مصرع اول صدر نہیں ہے بلکہ مصرع اول کا رکن اول صدر ہوتا ہے اور صدر کا آخری جز (اگر صدر بول کر موصوف نے مصرع لے رہے ہیں تو بھی صدر کے آخر کو جز کہنا قابل غور ہے) کو عروض نہیں بلکہ مصرع اول کا آخری رکن عروض ہے کیونکہ اس طرح اگر تعین نہ کی جائے تو حشو کو متعین مشکل ہو جائے گا۔ مصباحی صاحب کی عبارت میں ابتدا کی بھی تعین نہیں کی گئی ہے۔

مرزا امجد رازی نے ''بدیع الرضافی مدح المصطفےٰ'' لکھا ہے کہ ''بیت کے مصرع اول کے پہلے جز کو صدر اور آخری جز کو عروض کہتے ہیں بیت کے دوسرے مصرع کے جزِ اول کا نام ابتداء مطلع اور آخری جز کا نام ضرب و عجز ہے اور ان کے درمیان دونوں مصرعوں میں جو باقی رہا اس کو حشو کہتے ہیں۔ (ص ۸۸)

ا۔صنعت رد علی العجز علی الصدر: ۲۔صنعت ردالعجز علی العروض

کلام میں ایسے دو الفاظ لانا جن میں سے ایک شعر کے مصرع اول کے صدر میں ہو اور دوسرا لفظ مصرع ثانی کے آخر یعنی ضرب و عجز میں ہو۔ اس لفظ کے رکن میں تقدم و تأخر کی شرط نہیں ہے۔ اس کا نمونہ کلام رضوی میں دیکھیں:

خط ملے گر ملے بقا کا خط
رات دن میں پڑھوں نشہ کا خط

یہ شعر بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکّن یا بحر خفیف مسدس مخبون ابتر میں کہا گیا ہے۔ جس کا وزن ہے

فاعلاتن	مفاعلن	فعلن
خط ملے گر	ملے بقا	کا خط
صدر	حشو	عروض
رات دن میں	پڑھوں نشہ	کا خط
ابتدا	حشو	ضرب یا عجز

اس شعر کے مصرع اول کے صدر میں لفظ خط واقع ہے اور اسی لفظ کو مصرع ثانی کے عجز میں استعمال کیا گیا ہے یہی رد العجز علی الصدر ہے۔ اور لفظ خط مصرع اول کے عروض میں بھی واقع ہے اس طرح یہ شعر رد العجز علی العروض کو بھی شامل ہے۔

رد العجز علی الحشو:

خط پہ خط اور خط لکھا ہے جو
جانِ جاں ہے وہ پُر خطا کا خط

فاعلاتن	مفاعلن	فعلن
خط پہ خط او	رخط لکھا	ہے جو
صدر	حشو	عروض
جان جاں ہے	وہ پر خطا	کا خط
ابتدا	حشو	ضرب یا عجز

اس شعر کے مصرع ثانی کے عجز میں لفظ خط کا استعمال ہوا ہے یہی لفظ مصرع اول کے صدر اور حشو میں واقع ہے اس یہ شعر رد العجز علی الصدر اور رد العجز علی الحشو دونوں کی مثال بن رہی ہے۔

رد العجز علی الابتدا

خاک و خس جیسا ہے رضوؔی آپ کا
آپ کا بندہ ہے آقا آپ کا

یہ شعر بحر رمل مسدّس محذوف میں کہی گئی ہے۔ جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

فاعلاتن	فاعلاتن	فاعلن
خاک وخس جے	سا ہے رضوی ؔ	آپ کا
صدر	حشو	عروض
آپ کا بن	دہ ہے آقا	آپ کا
ابتدا	حشو	ضرب یا عجز

اس شعر میں لفظ ''آپ کا'' جو عجز میں واقع ہے وہی ابتدا میں بھی واقع ہے۔

تجاہل عارفانہ

اداس دل غم زدہ ہے چہرہ
نہ جانے کیا کیا سوال ہوگا
وہ پڑا لعل و گہر ہے کہ کوئی موتی ہے
سامنے ہو کے مرے جو بھی ہے کھُل جا اب کے

محاورہ:

تجھ کو دیکھوں اپنے بن میں
قسمت بن جائے اس بن میں

بن جانا: سنور جانا، خوشنما نما ہونا، بارونق ہونا، بگڑا ہوا کام ٹھیک ہونا

محاورے

سر قلم کرنا: سر کاٹنا۔ گردن مارنا

وجد میں اب جگر نہیں آتا
تو نظر کو نظر نہیں آتا

نظر نہ آنا (محاورہ) دکھائی نہ دینا

امید لگائے رضوؔی ہے ☆ تیرے ہی سائے رضوؔی ہے
گن تیرا گائے رضوؔی ہے ☆ کچھ نہ کچھ پائے رضوؔی ہے

گن گانا (محاورہ) تعریف کرنا۔ مدح سرائی کرنا

ہندی کا استعمال

چاند پہ شیدا چکور ہوا ☆ خوش اپنے من میں مور ہوا
ہر کوئی اس کی اُور ہوا ☆ مولیٰ مولیٰ کا شور ہوا

اس شعر میں (اُور) ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی طرف۔ سمت۔ جانب

عشق کا بہتا ہے وہ سمندر ☆ خاک نہیں ہے خاک کے اندر
پاک ہوا اور ایسا سندر ☆ سب کہتے ہیں اس کو قلندر

اس شعر میں (سندر) ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: خوبصورت۔ حسین و جمیل۔ شکیل

خود کہتا خود سنتا ہوں میں ☆ نام ترا ہی جپتا ہوں میں
عشق کی رو میں بہتا ہوں میں ☆ غوطہ لگا کر کہتا ہوں میں

اس شعر میں (جپتا) ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں: تسبیح پڑھنا۔ رٹ لگانا۔

زندہ زندہ رہے ☆ مر کر تیرا بندہ رہے
قبر میں حق حق کرتا رہے ☆ کرم پہ تیرے تکتا رہے

اس شعر میں (تکتا) ہندی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہے۔ دیکھنا

☆☆☆

کلامِ راہی صنائع وبدائع کے حوالے سے

جناب قمر سنبھلی۔ معاون مدیر ''رہنمائے تعلیمِ جدید'' دہلی

جناب غلام مرتضٰی راہی ایک منفرد لب و لہجے کے معتبر اور ممتاز شاعر ہیں، وہ اردو دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، کئی خوبصورت شعری مجموعے منظرِ عام پر آکر ان کی شعری صلاحیتوں کو ادبی حلقوں سے منوا چکے ہیں، اُن کے اِن شعری مجموعوں کے حوالے سے ان کے ناقدین اپنے اپنے ذہن، صلاحیت، پرکھنے اور سمجھنے کے مخصوص انداز سے نہ صرف اظہار خیال کر چکے ہیں بلکہ ان کی شعری خصوصیات کو بڑی گہری نظر اور ناقدانہ بصیرت کے مطالعے سے گزار کر ان کی نکتہ سنجیوں کو سنجیدگی کے ساتھ اجاگر کر چکے ہیں، اور مختلف پہلوؤں سے ان کے فکری گوشوں کو منظر عام پر لا چکے ہیں، راہی صاحب نصف صدی سے زائد مدت سے گیسوئے شعر سنوار رہے ہیں اور بحمدہٖ ان کا اشہبِ قلم ابھی پوری توانائی کے ساتھ دوڑ رہا ہے، یہ بھی ان پر اللہ کا انعام ہی ہے کہ خود پی ایچ ،ڈی، یعنی ادب کے ڈاکٹر نہیں ہیں، مگر نباض سخن کی حیثیت سے انہیں موضوع بنا کر اس کے تحت صنعتِ تضاد، صنعتِ تلمیح، صنعتِ ایہام، صنعتِ قلب، صنعتِ تجاہلِ عارفانہ، صنعتِ مراعات النظیر، صنعتِ ذو الشفتین، تشبیہ، شعری تعلی، تجنیس، تجنیس تام، تجنیس زاید، تجنیس ناقص، تجنیس مضارع، تجنیس مذیل، تصدیر، مجاز مرسل، وغیرہ وغیرہ کو، کوئی بھی قادر الکلام شاعران صفتوں کو شعوری طور پر نہیں برتتا ہر فطری شاعر اپنی افتادِ طبع کے مطابق بس شاعری کرتا ہے، اب اس میں خود بخود یہ صنعت در آتی ہیں اور کوئی پارکھی نظر اُن کو اسی کے کلام میں تلاش کر لیتی ہے، ایسا ہی کچھ جناب راہی کے کلام میں ہوا ہے۔

اُن کے یہاں جتنی صنعتوں کو جناب محمد ادریس رضوی نے ڈھونڈ نکالا ہے، یقیناً شعر کے وجود میں آنے کے وقت وہ شاعر کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ رہی ہوگی، لیکن بہر حال نشاندہی بہت صحیح اور درست معلوم ہوتی ہے، جنہیں نہ صرف کلام راہی کی مثالیں دے کر ثابت کیا گیا ہے بلکہ دیگر اساتذہ متقدمین کے اشعار سے بھی مثالیں پیش کی گئی ہیں، جس سے مصنف کی دقت نظر اور وسعتِ مطالعہ کا اظہار ہوتا ہے، عام قاری کی نگاہ ان خصوصیات اور صنعتوں کی طرف نہیں جاتی، جناب رضوی کی اس کتاب کے مطالعہ کے بعد قاری کلام راہی کے مطالعہ کی طرف راغب ہوگا، ایسی امید ہے، جنہوں نے کلام راہی کا مطالعہ کیا ہے ان کو لطف مزید حاصل ہوگا، نمونے کے لئے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

صنعت تلمیح

بن دیا مشیت نے جال میری راہوں میں
اب پتا نشاں میرا کون پانے والا ہے

اس شعر میں ہجرت کے وقت غار ثور میں قیام کے دوران مکڑی کے جالا بن دینے کی طرف اشارہ ہے۔

صنعت اِیہام

ایک زمانہ پتھر کا گزرا ہے
کتنا میٹھا تیشے کا پھل تھا جب

لفظ پھل ایک سے زائد معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تجاہلِ عارفانہ

پتا نہیں کہ وہ پتھر تھا، پھول تھا، کیا تھا
جدھر سے آیا تھا میں نے اُدھر اُچھال دیا

جان بوجھ کر انجان بننا۔

صنعت مرعات النظیر

جھیل ہو، تالاب ہو، یا ہو کنواں
ڈوبنے لائق انہیں گہرا کرو

گہرائی کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال۔

صنعت اِیہام کا ایک اور نمونہ

دشمن کی صف کو چیر کے جانا تھا اس پار
آخر نکال لے گیا میرا لہو مجھے

وہم میں ڈالنے والا بیان یا ایسے لفظ یا الفاظ کا استعمال جو معنی کے اعتبار سے مختلف سمجھے جا سکتے ہو۔

پیکر تراشی

لنگر انداز ہے منجھدار میں کشتی میری
کس طرف سے مجھے ملتا ہے اشارہ دیکھوں

یہ جمالیاتی پیکر تراشی کا بہترین نمومہ ہے۔

بہر حال مذکورہ کتاب کے مطالعے کے بعد کلام راہی کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ خود مصنف جناب محمد ادریس رضوی کی ان صنعتوں اور فنی باریکیوں پر دسترس کا اور علم بلاغت میں درک کا پتا چلتا ہے، فنی اور لسانی ذوق رکھنے والے خصوصاً اس کتاب کا لطف لیں گے، ایسا یقین ہے۔ ☆☆☆

غزل

کیوں محبّت ہَوا ہو رہی ہے — عاشقوں سے جدا ہو رہی ہے
اس کے جانے سے عاشقوں کو — لمحہ لمحہ سزا ہو رہی ہے

پوچھنے کا میرا حق ہے تجھ سے
مجھ سے کیوں بے وفا ہو رہی ہے

گردشِ رات دن کی طرح تم
اِس پہ اُس پر فدا ہو رہی ہے

بادلوں کی طرح تم گرج کر
اب نئی اک بلا ہو رہی ہے

تجھ کو معلوم ہے اپنی وقعت
مجھ سے کیوں پھر خفا ہو رہی ہے

اب کہاں تم کو ڈھونڈے گا رَضویؔ
اب تو تم لا پتا ہو رہی ہے

حمدربّ ذوالجلال

عشق تو لا جواب ہے میرا
سب سے عمدہ یہ خواب ہے میرا

ڈھونڈتا اپنے دل میں ہوں تجھ کو
مشغلہ یہ گلاب ہے میرا

موت بھی زیست کی طرح ہوگی
روز کہتا نصاب ہے میرا

کون مضبوط ہاتھوں سے پکڑے
زندگی کا رُباب ہے میرا

جان و تن پر مرے برستا ہے
آہِ دل کا سحاب ہے میرا

اک تو ہی تو ہر ایک شے میں ہے
منکروں کو جواب ہے میرا

خاک پر ناز ہے مرے دل کو
دل جو عزّت مآب ہے میرا

آپ اہلِ نظر نہیں ورنہ
عشق تو آفتاب ہے میرا

آپ سے میں کہاں مخاطب ہوں
اپنی جاں سے خطاب ہے میرا

کھول کر آنکھ دیکھئے پھر سے
صاف لکھّا حساب ہے میرا

دیکھئے ہاتھ سے ذرا چھو کر
نرم کتنا تراب ہے میرا

گر نہ جائے کہیں سمندر میں
تھامیئے یہ حباب ہے میرا

راز کو کردیا عیاں مِیں نے
یہ طریقہ خراب ہے میرا

کیجئے اک نگاہ رَضویؔ پر
حال خستہ جناب ہے میرا

☆☆☆

پردہ رُخ سے ہٹا نہیں ہوگا
پینے میں کچھ مزا نہیں ہوگا

پردے میں تو چھپا نہیں ہوگا
عاشقوں کا بھلا نہیں ہوگا

تیری قدرت سے کیا نہیں ہوگا
تجھ پہ دل کیوں فدا نہیں ہوگا

پی رہا ہے جو مدّتو ں سے مئے
کیسے اس پر نشہ نہیں ہوگا

لکھ دیا تو نے جو مقدر میں
اس سے بڑھ کر عطا نہیں ہوگا

نعمتیں بے شمار ، ہیں تیری
بندے نے سب گنا نہیں ہوگا

چھوڑ کر چل دیا جو در تیرا
اس کو کچھ فائدہ نہیں ہوگا

آیئے عشق کا سبق پڑھیے
ایسے تو دل فنا نہیں ہوگا

دُور رکھئے جہان کودل سے
ورنہ دل کو نشہ نہیں ہوگا

کیجئے عہد پختہ اب رَضویؔ
دل خدا سے جدا نہیں ہوگا

☆☆☆

چلے طور پر ہے جو ہمّت کسی میں
لُٹادے جہاں ہے محبّت کسی میں

پڑا پردہ رُخ سے ہٹا کر ذرا سا
تجھے دیکھے کوئی ہے جرأت کسی میں

نہ تڑپی نہ اُچھلی نہ چمکی نہ نکلی
ترے حُسن کی پیاری طلعت کسی میں

اُٹھادے گا پردہ دکھادے گا چہرہ
جو ہوگی کسی کی محبّت کسی میں

اُٹھے گا قیامت میں پردہ اُٹھے گا
کہ ہے عشق کی کیسی صورت کسی میں

جھکا کر جبیں جو خدا کو منالے
ہیں ایسی عبادت ریاضت کسی میں

نہ کرتا عیاں راز ہے اپنے دل کا
بھری ایسی ہے تو نے حکمت کسی میں

زمیں میں زماں میں فلک میں سما میں
کرا دے تو اپنی زیارت کسی میں

ذرا روبرو ہوکے میں تجھ کو دیکھوں
عیاں کردے تو اپنی صورت کسی میں

نشہ عشق کا دل پر چڑھتا رہے گا
جو بھیجے گا تو اپنی رحمت کسی میں

بلال وعلی بکر عثمان کی سی
تُو رکھ دے محبّت اخوّت کسی میں

نئی شان سے جلوہ گر وہ ہوئی ہے
لئے علم وحکمت مشیّت کسی میں

ترے روبرو لامکاں میں جو ٹھہرا
نہ ایسا کوئی ہے نہ ہمّت کسی میں

وہاں کی خبر کون کس کو سُنائے
حقیقت عیاں تھی حقیقت کسی میں

نظر کو مری تو نظارہ کرا دے
دکھادے ذرا سی حقیقت کسی میں

نہ طوفان آتا نہ برباد ہوتے
نہ ہم دیکھتے یہ خشیّت کسی میں

خوشی ہی نہیں غم بھی پیارے ہیں پیارے
نہیں ہے سمجھنے کی طاقت کسی میں

چلا کر دکھایا محبّت کا رستہ
کہاں ہے تری جیسی شفقت کسی میں

مری لے مری سُر مری تان میں آ
نہ آئے گی تو جا فصاحت کسی میں

تیری حمد تیری ثنا تیری مدحت
مجھے چھوڑ کر جا نہ عزّت کسی میں

نہ جائے گی عزّت نہ آئے گی ذلّت
نہ، جو ڈوبے بے جا محبّت کسی میں

بُلا کر پلایا پلا کر دکھایا
محبّت ہی بن کر ہے ذلّت کسی میں

بُلا کر مقامِ محبّت میں ہم کو
ہماری وہ رکھ دی نصیحت کسی میں

چھپا کر جو پیتے چھپا کر ہی رکھتے　　نہ جاتی ہماری علامت کسی میں
کبھی خود سے ہم خود تو پوچھیں ہماری　　چلی کیوں گئی ہے خلافت کسی میں
مقامِ مصیبت میں رہ کر تو دیکھو　　یہیں سے اُبلتی ہے رحمت کسی میں
مرے دل کا پینا مری راہ چلنا　　دعا ہے کہ اُترے یہ حکمت کسی میں
مری روشنی میں مری بات سمجھو　　کہ رکھ دی خدا نے طریقت کسی میں
ملے آنِ واحد میں وحدت کا دریا　　اُچھل جائے دریائے رحمت کسی میں
نہ لکھتا اگر میں محبت کی باتیں　　نہ آتی کسی دل کی حدّت کسی میں
مٹا کر مری زندگی کی علامت　　سُلا دے گا برسوں وہ تربت کسی میں
بقا کی دوا پی کے رَضوی کہے گا　　عیاں ہوگئی ہے حقیقت کسی میں

☆☆☆

کیسے رہے گا دل مرادز پہ ترے بتا کہ یوں
اپنی لگن لگا کے تو دل کو مرے دکھا کہ یوں
دل پہ مرے تو فضل کی ایسی ہوا چلا کہ یوں
کرتا رہوں تری ثنا ہو کے ترا فدا کہ یوں
کرتا رہوں دعا ترے در پہ مَیں یا خدا کہ یوں
چھوٹے نہ در ترا کبھی، ایسی لگن لگا کہ یوں
دنیا کی فکر سے رہوں دُور مَیں یا خدا کہ یوں
دیکھوں کبھی نہ غم کا منھ ایسا مجھے بنا کہ یوں
شکر ادا کروں ترا دل کو خوشی سنا کہ یوں
کِھلتا رہے گُلاب، دل کو مرے دکھا کہ یوں
بندہ ترا مَیں ہو کے بھی در پہ ترے رہوں پڑا
جس کو مری خبر نہ ہو ایسی دوا پلا کہ یوں
عشق میں تیرے کس طرح جلتے ہیں عاشقوں کے دل
آگ وہی لگا کے تو دل کو مِرے جلا کہ یوں
دُکھ میں گِھرا ہے کب سے رَضوی لے خبر تو یا قوی
چین و سکون دے کے تو غم سے اِسے چھڑا کہ یوں

نعتیں

مرتبہ اعلیٰ ہے آقا آپ کا　　والضحیٰ چہرہ ہے آقا آپ کا
آسماں تا عرش و جنّت فرش پر　　ہر جگہ چرچا ہے آقا آپ کا

چاند سورج ہاتھ باندھے آگئے　　معجزہ ایسا ہے آقا آپ کا
حشر میں بھی نعت ہوگی آپ کی　　خود خدا کہتا ہے آقا آپ کا
نارِ دوزخ سے رہیں گے دُور ہم　　جانفزا مژدہ ہے آقا آپ کا
اپنے جیسا کیسے سمجھیں آپ کو　　جب لقب طٰہٰ ہے آقا آپ کا
عرش و کرسی، لامکاں اک اک سماں　　سب کا سب دیکھا ہے آقا آپ کا
جان میری، دل مرا، آنکھیں مری　　سب کا سب صدقہ ہے آقا آپ کا
شیث و موسیٰ، ھود و عیسیٰ کی جبیں　　نور کا ہالہ ہے آقا آپ کا
عشق و الفت کی دوائیں دیجیے　　مانگتا بندہ ہے آقا آپ کا
خاک و خس جیسا ہے رَضوی آپ کا　　آپ کا بندہ ہے آقا آپ کا

☆☆☆

میرا ان سے سلام کہہ دینا　　ہند میں ہے قیام کہہ دینا
غمزدہ ان کے ایک عاشق کا　　حال و ماضی تمام کہہ دینا
تھام کر رکھیں اپنے ہاتھوں میں　　میرے دل کا زمام کہہ دینا
با ادب ہو کے نام لیتا ہوں　　ان کا ہی صبح و شام کہہ دینا
لوگ کہتے ہیں حال اچھا ہے　　دل کا ٹوٹا ہے بام کہہ دینا
کیا کہوں کیا سناؤں واضح ہے　　ان پہ دل کا کلام کہہ دینا
اک نظر کردیں وہ اگر مجھ پر　　میرا بن جائے کام کہہ دینا
میرے تن میں چھپے عدوؤں کی　　تیغ ہے بے نیام کہہ دینا
رکھیں اپنی پناہ میں مجھ کو　　دُزد ہے بے لگام کہہ دینا
فضل فرمائیں پھر دکھادیں وہ　　پاک مسجد حرام کہہ دینا
اور کچھ دیں نہ دیں مگر دیں وہ　　عشق کا ایک جام کہہ دینا
نفس نے جان کو بنا لیا ہے　　آج اپنا غلام کہہ دینا
ہے تخلّص صبا مرا رَضوی　　اور ادریس نام کہہ دینا

☆☆☆

فرش سے عرش پر ایک پَل کا سفر
ساتھ ہے خود خدا بابِ الفت کھلا
سدرۃ المنتہیٰ آج ہے زیرِ پا

مرتبہ آپ سا کب کسی کو ملا
عرش پر جب چلے شاد غلمان تھے
کہتے تھے با ادب اک زباں ہوکے سب
رکیے میرے شہا آپ کی لون بلا
لامکاں تک گزر آپ کی سربسر
دو کمانوں میں تو کہہ رہا ہے وہ ھُو
قاب قوسین کا کون جانے سما
تونے کی گفتگو ربّ سے روبرو
جب ملا تجھ سے ھو کہہ اٹھا وحدہٗ
مَیں نے کی جو وحی آپ پر اے نبیؐ
بات ہے راز کی عشق کے ساز کی
تیرے انداز کی ناز کی ناز کی
اک تجلّی چلی روحِ سینا جلی
واقعہ طور کا یاد ہے دُور کا
ساتھ بارات ہے آج کی رات ہے
خود خدا نے کہا آفریں مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم
دیکھ مجھ کو ذرا اب نہ پردہ رہا
یہ عنایت مری ہے حکایت تری
دیکھ لے خلد بھی حور و غلمان سبھی
عرشِ اعظم پہ تو گھوم لے سوبسو
کہہ دے امّت سے تو رب سے کی گفتگو
تحفہ رب سے ملا ہے نمازوں کا وا
زوجِ رَضویؔ شہا آپ پر ہے فدا

☆☆☆

رباعیات

ہر دَرد پکارے کہ دوا لے کر آ
بے دَرد کو تم دَرد پلاؤ جھٹ پٹ
اسرارِ محبت کا نشہ لے کر آ
مدہوش کو تم ہوش میں لاؤ جھٹ پٹ

ہر بند کھلے اور کہے اللّٰہ ھُو
ہو مجھ پہ نشہ عشقِ خدا لے کر آ

O

یوں در پہ ترے مَیں نے گزارا ہوتا
ہر سمت نظارے پہ نظارہ ہوتا
ہر عضو مرا پھول ہزارہ ہوتا
بد بخت نہیں بخت ستارہ ہوتا

O

بازار وفا لوٹ رہے ہیں غاصب
کیوں جانِ وفا کوٹ رہے ہیں غاصب
غاصب پہ جو سرکار مہرباں ہوئی
تو جیل سے بھی چھوٹ رہے ہیں غاصب

O

اک پھول نیا کوئی کھِلا ہے گُپ چُپ
اُس پھول کی ہر سَمت ضیا ہے گُپ چُپ
خاموش مگر مست پڑا ہے شاغل
ہے بندہ مگر نور بنا ہے گپ چپ

O

اعمال میں ہیں میرے دعائیں ثابت
ہر لمحے کی آہوں کی شعاعیں ثابت
کچھ اور کرو یاد خدا کو رَضوی
تحریر میں ہو جائیں ادائیں ثابت

جو بارِ گنہ یار لئے پھرتا ہے
اُس کو درِ مولیٰ پہ جھکاؤ جھٹ پٹ

O

ہر عضو پہ اک بزم سجادے وارث
اس بزم کو پُر نور بنادے وارث
جب بندہ مجھے بندہ بنایا تونے
دُھن اپنی ذرا دل میں جگادے وارث

O

نے حرص نہ خواہش نہ کوئی ہے لالچ
وہ دُور ہے مجھ سے کہ دُوئی ہے لالچ
بدحال پڑا یار وہ انساں ہے کیوں
کیا دل میں پڑی اس کے ہوئی ہے لالچ

O

یہ پردہ پڑا پردہ اٹھاؤ ہم پر
بے پردہ رہو پہرا بٹھاؤ ہم پر
ہم رند بنے جام لٹاؤ ہم پر
ہر گھونٹ پہ اک پردہ ہٹاؤ ہم پر

O

اے جان وفا عشق و محبت جائز
ہر لمحہ یہاں خوب مشقت جائز
بے جا نہ پھرو کام کرو ہمت سے
اس راہ پہ نخوت نہ رعونت جائز

☆☆☆

آج رات جھوم لے

فیروز عالم ۔ امریکا

کوئی تیس سال امریکا میں ایک تارک وطن کی زندگی گذارنے کے بعد جب میں نے زندگی کے اس دور میں قدم رکھا جس کے بعد بقول شاعر ایک مرگ ناگہانی اور ہے، تو میرا دل واپس اپنے وطن لوٹنے کو چاہا۔ مجھے امریکا سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ میری امریکا کی زندگی بیحد کامیاب تھی اور مجھے اسکا بھی اعتراف ہے کہ اس ملک نے میری صلاحیتوں کو نہ صرف پہچانا تھا بلکہ انہیں اجاگر کرنے میں بھی قابل قدر کردار ادا کیا تھا مگر اپنوں اور اپنے ماحول سے دور ہونے کی وجہ سے مجھے ہمیشہ ایک اندرونی تنہائی کا احساس رہتا تھا جو کبھی دور نہیں ہوا۔ میرے زیادہ تر دوست بھی مختلف ممالک میں ملازمت کے بعد اب اپنے بڑھاپے میں واپس پاکستان پہنچ گئے تھے اور وہاں ایک پر مسرت زندگی گذار رہے تھے۔ جہاں میں امریکا میں شام کے ملگجے میں اپنی تنہائی اور ایک بے نام اداسی کا شکار ہوتا تھا، وہ مجھے بتاتے تھے کہ وہ کیسے شام کو کسی کے گھر جمع ہو جاتے ہیں اور پھر پرانی باتیں، گذرے ایام کے قصوں اور لطیفوں کی محفلیں گرماتے ہیں۔ مجھے یہاں اب کوئی روکنے والا بھی نہیں تھا، بچے بڑے ہو کر اپنے اپنے گھروں کے تھے اور دور دراز کی ریاستوں میں بس گئے تھے اور شریک حیات کا ساتھ بھی کئی سال پہلے چھوٹ گیا تھا۔

میں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ ابھی میں ان تیاریوں میں مصروف ہی تھا کہ مجھے سعودی عرب کی ایک بڑی یونیورسٹی سے ایک سال کی پیشکش ہوئی۔ مجھے اس عمر میں مزید کسی ملازمت کی نہ تو تلاش تھی نہ ہی ضرورت مگر یہ سوچ کر کہ سعودی عرب پاکستان سے صرف دو گھنٹے کی پرواز پر ہے اور وہاں سے میں ہر ویک اینڈ پر کراچی جا سکتا ہوں مزید یہ کہ اس ایک سال کے عرصے میں میں وہاں اپنی رہائش کے انتظامات مکمل کر سکتا ہوں اور پھر سعودی عرب میں ایسے مقامات بھی تھے جنکی زیارت سے میں اب تک محروم تھا میں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

ریاض، سعودی دارالحکومت ایک جدید شہر ہے جہاں مجھے موجودہ دور کی تمام سہولتیں میسر تھیں۔ میری ذمہ داریوں میں زیادہ تر لیکچر دینا تھا جو میں یونیورسٹی کے بڑے آڈیٹوریم میں دیتا تھا۔ ان میں طلبہ کے علاوہ فیکلٹی بھی ہوتی تھی۔ کچھ پاکستانی بھی تھے مگر میں ان سے واقف نہ تھا۔

ایک دن میں لیکچر کے بعد کالج کی کیفے ٹیریا میں بیٹھا کافی کے مزے لے رہا تھا کہ ایک صاحب میرے قریب آئے۔ وہ میرے ہی ہم عمر تھے۔ کھچڑی بال، سر کی پشت پر پھیلتا گنج اور آنکھوں پر موٹا سا چشمہ، مجھ سے پوچھنے لگے کیا تم فلاں اسکول میں پڑھتے تھے۔ مجھے وہ اسکول اور شہر چھوڑے پینتالیس سال ہو چکے تھے مگر مجھے وہ شہر اور اسکول یاد تھا۔ میں نے کہا جی ہاں، کہنے لگے میں احمد ہوں۔ مجھے کوئی احمد یاد نہ تھا۔ بے تکلفی سے کہنے لگے "یار میں تمہارا کلاس فیلو تھا"۔ ہماری کلاس چھوٹی تھی یہی کوئی پینتالیس یا پچاس لڑکے، مگر مجھے یا تو اپنے قریبی

دوست یاد تھے یا پھر وہ لڑکے جو کسی وجہ سے مشہور تھے ظاہر ہے ان میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو مجھے پینتالیس سال بعد یاد رہتی۔ میں نے اخلاقاً کہا بیٹھیئے، کیا کافی کا آرڈر دوں۔ کہنے لگے نہیں کافی نہیں پیتا ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ پھر کہنے لگے تمہیں "سر بشارت" تو یاد ہونگے۔ مجھے بشارت صاحب یاد تھے وہ ایک اچھے استاد تھے اور لڑکوں میں مقبول تھے۔ وہ مجھے بھی کافی سراہتے تھے اور میں انکا پسندیدہ شاگرد تھا۔ وہ کچھ دیر سر بشارت کی اور اس دور کے دوسرے ٹیچرز کی باتیں کرتے رہے۔ ہم میں جلد ہی بے تکلفی ہو گئی شاید اس کا مقصد مجھے اس بات کا ثبوت فراہم کرنا تھا کہ واقعیٔ وہ میرا ہم جماعت رہا تھا۔ پھر کہنے لگا یار تم بھی مجھے یہاں اچانک ملنے پر یاد تو نہ آتے مگر تمہارے لیکچر سن کر احساس ہوا کہ یہ تو وہی لڑکا خالد ہے جو میری کلاس میں تھا۔ تمہاری آواز اور بولنے کا انداز بالکل نہیں بدلا ہے۔ مجھے اس کا یہ سب کچھ کہنا اچھا لگا کہ کسی نے مجھے پینتالیس سال بعد بھی یاد رکھا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے اپنائیت کا احساس جاگا۔ مجھے اس کی بالکل توقع نہیں تھی کہ میں سعودی عرب میں اپنے کسی پرانے ہم جماعت سے ملوں گا۔ ہم کافی دیر اپنے اسکول کی باتیں کرتے رہے۔ ہمارے اسکول کے پیچھے کھیت تھے جہاں سرسوں کے پیلے پھول کھلتے تھے۔ ساتھ ہی کلکٹر کا آفس تھا جہاں برگد کے قدیم اور بڑے بڑے درخت تھے جنکی داڑھیاں زمین میں گڑھی ہوتی تھیں)۔ اس سے ملاقات مجھے چند لمحوں کو اسی بیتے دور میں لے گئی۔ ہمارے کچھ دوست بھی مشترک تھے وہ مجھے ان کے بارے میں بھی بتاتا رہا۔ پھر اسے کہیں جانا تھا۔ ہم نے فون نمبروں کا تبادلہ کیا اور وہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

سعودی عرب میں میرے پاس بھی کچھ کرنے کو نہ تھا پھر میں ویسے بھی بیحد ماضی پرست ہوں اور ہر اس چیز سے لپٹ جانا چاہتا ہوں جو مجھے ماضی کی یاد دلائے۔ میں اس سے سننا چاہتا تھا کہ وہ ان سالوں میں کہاں رہا، کیسے زندگی گذاری۔ سن ساٹھ اور ستر کی دہائیاں عالمی معاشی اور سیاسی تناظر میں ایک خاص اہمیت اور دلچسپی کی حامل ہیں۔ اس دور میں دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں بہت سے ممالک کی تعمیر نو ہو رہی تھی اور مشرق وسطیٰ کے ممالک تیل کی دولت سے نئے نئے واقف ہونے کی وجہ سے افرادی قوت کی قلت کا شکار تھے۔ لوگ جوق در جوق تیسری دنیا سے نکل کر جہاں موقع ملے، باہر جا رہے تھے، ہر شخص کی اپنی ایک علیحدہ کہانی تھی۔ میں بھی اس کی کہانی جاننا چاہتا تھا۔ مجھے اس کا دم غنیمت لگا میں نے اسے کئی دفع فون کیا مگر اس کا فون بند تھا۔ کچھ دن بعد احمد کا فون آیا خوش تھا کہنے لگا کچھ کام کے سلسلے میں پاکستان گیا ہوا تھا کل ہی لوٹا ہوں۔ ہم نے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کیا۔

ہم دوسری شام ریاض کی مشہور پاکستانی ریسٹورینٹ "مرحبا" میں ملے کھانے کے بعد میں نے کافی اور احمد نے سبز چائے کا آرڈر دیا۔ تھوڑی دیر میں بیرا ایک چینی کی پھول دار پیالی میں کافی اور شفاف شیشے کے چھوٹے سے مگ میں سبز چائے رکھ گیا۔ میں اس کے حالات جاننے کے لئے بیقرار تھا۔ اس نے یہ سال کہاں اور کیسے گذارے، زندگی سے اس نے کیا سیکھا اور زندگی نے اسے کیا دیا۔ وہ کچھ دیر سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ پھر میرے کچھ دوستوں کے نام لے کر کہنے لگا "یار تم چند لڑکے تو پڑھائی میں بڑے تیز تھے اور اسکے ساتھ ہی تمہارے ارادے بھی بلند تھے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہم تو بالکل اوسط درجے کے طالب علم تھے پھر ایک چھوٹے شہر میں رہتے ہمیں مستقبل کے بارے میں بہت کچھ معلوم بھی نہ تھا۔ بس ایک بے مقصد اور کوئی راہ متعین کئے بغیر زندگی کی راہ پر چلے

جا رہے تھے۔۔ بہت سوچتے تھے تو یہ کہ ایم اے کر کے کسی دیہی کالج میں لیکچرر ہو جائینگے مگر سن ستر کی دہائی ایسی تھی کہ مشرق وسطیٰ، بلکہ یوں کہوں ساری دنیا ہی کھلی تھی۔ اپنی احساس کمتری کی وجہ سے یوروپ یا امریکا کا تو تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر جیسے ہی سعودی عرب سے ایک درمیانہ درجے کی ملازمت کا موقعہ ملا میں یہاں نکل آیا۔ بس پہلے ایک تیل کی کمپنی میں کچھ سال گزارے اور اسکے بعد اسی یونیورسٹی میں کیمسٹری کے شعبہ میں ڈمانسٹریٹر ہو گیا۔ بس اس وقت سے اب تک یہیں ہوں۔ پلک جھپکتے تیس سال گذر گئے۔ اب ریٹائرمنٹ قریب ہے کیونکہ سعودی عرب میں ساٹھ سال کے بعد لازمی ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی میں نے جینا شروع بھی نہیں کیا ہے کیونکہ ساری زندگی مستقبل کے اس خواب کی نذر کر دی ہے کہ جب یہاں سے واپس جا کر اس مشقت کے صلے میں جو کچھ بھی ملا ہے اس کے سہارے ایک اچھی زندگی شروع کرونگا تو پھر صحیح طور پر جینا شروع کروں گا۔'' اس نے سبز چائے کا شیشے کا مگ اٹھایا۔ کچھ دیر اس میں جھلکتے سبز رقیق کو دیکھتا رہا پھر ایک چسکی لی اور کہنے لگا ''تمہیں اندازہ نہیں ہوگا کہ یہاں پہلے پہلے آنے والے لوگوں کو کن مشکلات کا سامنا تھا۔ یہ ملک بیحد پسماندہ تھا۔ میں سعودی عرب کی برائی نہیں کر رہا صرف یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ اس وقت حالات کیسے تھے۔ ریاض میں پینے کو صاف پانی نہیں ملتا تھا۔ مچھروں کی بہتات تھی۔ پختہ سڑکوں کا کوئی وجود نہ تھا اور اس پر غیر ملکی ''مہمان کارکنوں'' کے ساتھ سلوک بھی بہت اچھا نہ تھا۔ کتنے مشکل اور صبر آزما دن رات تھے۔ خود پر ترس بھی آتا تھا اور غصہ بھی مگر کشتیاں جلا چکے تھے۔ پھر وطن سے دوری کسے نہیں ستاتی، تم تو امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں تھے کیا تمہیں وہاں گھر کی یاد نہ آتی ہوگی یا تنہائی کا احساس نہ ہوتا ہوگا؟؟'' اس نے میری دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے مشی گن میں کیسے کیسے تنہا دن گذارے ہیں اور کتنی دفعہ سوچا ہے کہ ہر چیز کو آگ لگا کر وطن واپس لوٹ جاؤں مگر مجھے بھی مستقبل کی آس روک لیتی تھی۔ اس نے کہا ''خالد۔۔ میں نے اپنے تمام حال کو اپنے مستقبل کے ہاتھوں گروی رکھ دیا ہے۔ میرا ''حال'' تھا بھی کیا، ایک غیر یقینی کا عالم تھا ہر سال اس کی فکر رہتی تھی کہ شاید اگلے سال یہ کانٹریکٹ منسوخ ہو جائے اس لئے سوچتے تھے جتنا جوڑ سکو جوڑ لو۔ خدا نے اولاد نہیں دی مگر مجھے ایک بہت پیار کرنے والی رفیقہ حیات ضرور ملی جس سے دور رہنا میرے لئے مشکل تھا۔ میں اسے یہاں لا سکتا تھا مگر میری آمدنی اتنی نہ تھی کہ اس کے بعد میں پاکستان میں ایک اچھا گھر بنا سکتا یا اتنا سرمایہ جمع کر سکتا جو بڑھاپے میں کام آتا۔ میں نے اسکی جدائی برداشت کی، بس ہر چھ مہینے بعد دو ہفتے کے لئے پاکستان چلا جاتا تھا اور اسی طرح سال میں دو مرتبہ وہ یہاں آ جاتی تھی۔ جوانی کی یہ تنہا راتیں میں نے کیسے کاٹی ہیں یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں کبھی ہنس کر مذاق میں اپنی بیوی کو دو ہفتے کی سہاگن کہتا تھا۔ یہ جذباتی طور پر مشکل تھا مگر پھر میں ان مزدوروں کو دیکھتا تھا جو برصغیر سے آئے تھے اور صرف دو سال میں ایک دفعہ گھر جاتے تھے۔ ان کی آزمائش تو مجھ سے کہیں زیادہ مشکل تھی وہ بھی تو اپنے حال کو مستقبل پر قربان کر رہے تھے'' وہ تھوڑی دیر کو چپ ہو گیا۔ دور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ پھر بولا ''خالد۔۔ میں نے یہاں اپنی ذات پر کم سے کم خرچ کیا ہے، کوشش کر کے ایک ایک ریال ایک ایک روپیہ مستقبل کے لئے اٹھا رکھا ہے۔ اب میں خوش ہوں شاید میری منزل قریب ہے۔ میں نے ایک اچھا گھر بنا لیا ہے، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ گھر بالکل میرے خوابوں کی تعبیر ہے مگر پھر بھی بہت اچھا ہے۔ کچھ اثاثہ بھی ہے اور ایک اچھا ماہانہ آمدنی کا

ذریعہ بھی۔'' میں یہ سن کر کچھ افسردہ ہو گیا احمد اسی دور کی نسل سے تھا جس دور کا میں ہوں۔ مجھے یکا یک عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' یاد آ گیا۔ ہماری نسل نے ستر کی دہائی کی مالی فراوانی سے فائدہ ضرور اٹھایا مگر اس کے ساتھ ہم نے غریب الوطنی کے دکھ بھی اٹھائے۔ میری نظر میں احمد نے یہ غلطی ضرور کی تھی کہ اس نے مستقبل کی خاطر اپنے حال کو ضرورت سے زیادہ قربان کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہم جب بھی ملتے میں اس سے کہتا احمد تمہیں کچھ اپنے اوپر بھی خرچ کرنا چاہئے۔ ایک اچھی زندگی گذارو۔ خود اپنے آپ کو بھی اپنی محنت اور کامیابیوں کا انعام دو مگر وہ بہت ہی خستہ حالت میں زندگی گذارتا تھا۔ ایک چھوٹی کار خرید سکتا تھا مگر مزدوروں کے ساتھ بسوں میں سفر کرتا تھا۔ ہر چیز کی قیمت کو سات سے ضرب کر کے روپوں میں تبدیل کرتا تھا، کہتا تھا بس چند ماہ رہ گئے ہیں اب اسکا گھر فرنش ہو رہا ہے۔ وہ اور اسکی بیوی مل کر اسے خوبصورتی سے آراستہ کر رہے ہیں۔ اب چند ماہ میں وہ مکمل ہو جائیگا۔ ابھی اسے کچھ ماہ اور سعودی عرب کی کمائی کی ضرورت ہے۔ پھر اسکے بعد وہ گھر چلا جائیگا اور ان سارے صبر آزما دنوں کی کسر نکال لیگا۔ ہر شام دوستوں کی محفلیں منعقد کریگا، زور زور سے قہقہے لگائے گا اور زندگی کی بوتل سے وہ سارا رس کشید کر لیگا جو اس نے اب تک بچا بچا کر رکھا ہے۔ کچھ دنوں بعد وہ پھر مجھ سے ملا، پر جوش و پر امید تھا۔ کہنے لگا ڈرائینگ روم میں بلجیم کے کرسٹل کا فانوس لگ گیا ہے اور تمام فرنشنگ بھی مکمل ہو گئی ہے ریٹائرمنٹ سے دو ماہ قبل ہی استعفی دیدیا ہے اور ریٹائرمنٹ کا پیسہ بھی ملنے والا ہے۔ دو ہفتے بعد کراچی کے لئے سیٹ بک کرا لی ہے۔

تین دن بعد مجھے پاکستان کونسلیٹ سے فون آیا ''احمد علی خان صاحب کا اچانک حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا۔ کل انکی میت کراچی جا رہی ہے آپ سے نماز جنازہ میں شرکت کی درخواست ہے''

ختم شد

مکتوباتی ادب کی اشاعت کے سلسلے کی ایک اہم کڑی

مناظر عاشق ہرگانوی بنام نذیرؔ فتح پوری

(مجموعۂ خطوط)

شائع ہو چکی ہے۔ صفحات ۱۲۰ / مجلد کتاب۔ قیمت۔ ۱۵۰ / روپئے

رابطہ

نذیرؔ فتح پوری۔ موبائل نمبر 09822516338

لکشمن ریکھا

کلدیپ جوشی، فرید آباد (ہریانہ) 09899825100

یوں کہنے کو تو بابو بالک رام ڈرائنگ روم میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ لیکن اُن کا بار بار عینک اتارنا' پھر پہننا' بغیر پڑھے اخبارات کے صفحات کو الٹنا پلٹنا' کمرے میں ٹہلنے لگنا ان کے اضطراب کا مظہر تھا۔

اتنے میں کال بیل بجی۔ بابو جی نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے دھوبی کا لڑکا کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا بابو جی نے جھنجلا کر کہا ''پریس کے لیے کپڑے نہیں ہیں'' اور ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ صوفے پر بیٹھ گئے اور وال کلاک کو دیکھنے لگے۔ دونوں سوئیاں گیارہ پر تسلط جمائے بیٹھی تھیں۔ انھوں نے بے اعتنائی سے بغیر عینک لگائے ایک بار پھر اخبار اٹھایا۔ جو صفحہ ان کے سامنے تھا اس پر پڑھنے کو کچھ تھا نہیں سارا صفحہ اشتہارات سے بھرا پڑا تھا۔

کال بیل بجی، جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تو ایک نو وارد سامنے کھڑے تھے۔

''جی آپ سیفی صاحب ہیں''

''جی نہیں میں سیفی نہیں ہوں ان کا فلیٹ سامنے والا ہے'' اور بڑبڑاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔ ان کی اتنی جھنجلاہٹ اور بے تابی سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں کسی کا انتظار ہے۔ ہر گزرتا لمحہ ان کی گھبراہٹ میں اظافہ کر رہا تھا۔ وال کلاک پر نظر گئی دونوں سوئیاں بارہ پر بیٹھی ان کا منہ چڑا رہی تھیں۔ بارہ سے بڑی سوئی نے آگے پیش قدمی کی۔ بابو جی نے یہ سوچ کر کہ ان کا انتظار بس انتظار ہی بن کر رہ گیا ہے صوفے سے اٹھے اور رسوئی گھر کی طرف قدم بڑھائے۔

بابو بالک رام کو اس فلیٹ میں آئے کوئی دس سال ہی ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ ایک گیارہ منزلہ ٹاور کی چھٹی منزل پر واقع تھا۔ اس سے پہلے وہ شہر کی ایک پاش کالونی میں اپنے نجی بنائے ہوئے مکان میں رہتے تھے۔ محلے میں اچھا ملنا جلنا تھا۔ لیکن کوئی پندرہ سال پہلے ان کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے چار سال بعد ان کی ہمسفر حیات انہیں داغِ مفارقت دے گئیں۔

لڑکے اور لڑکی کی شادی سے دوران ملازمت ہی فراغت پا چکے تھے۔ لڑکے نے اونچی تعلیم حاصل کر رکھی تھی اسے کینڈا میں اچھی ملازمت مل گئی تھی اور وہ اپنی بہو اور بچے کو لے کر کینڈا میں ہی بس گیا تھا۔ اس کا بے حد اصرار تھا کہ اکیلے رہتے ہو مکان کو فروخت کر کے کینڈا ہی چلے آؤ لیکن بابو بالک رام اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ ایک تو اپنے بنائے ہوئے گھر در و دیوار سے محبت اور دوسرے لڑکی کا پیار جو اسی شہر کی دور دراز کالونی میں اپنے فلیٹ میں رہتی تھی۔

اب بڑھاپے نے پوری طرح دستک دے دی تھی۔ اور بابو بالک رام کو اس بات کا احساس تھا کہ بیماری کی خبر پاتے ہی لڑکی اور داماد بھاگے چلے آتے ہیں اور انہیں کافی تکلیف ہوتی ہے۔ دوسری طرف داماد اور لڑکی کا

بھی اصرار تھا کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ کئی فلیٹ ابھی خالی ہیں۔ آپ ہمارے ساتھ نہ سہی اپنے فلیٹ میں رہنا۔ آپ کی انفرادیت بھی قائم رہے گی اور ہمارا ساتھ بھی۔

نزدیکی یار دوستوں نے بھی یہی صلاح دی کہ سرعت سے گرتی صحت کے مدنظر اب اکیلا رہنا مشکل ہے۔ بابو جی نے ہاں بھر دی۔ جہاں لڑکی پہلی منزل پر رہتی تھی اسی ٹاور میں چھٹی منزل پر ایک فلیٹ بکاؤ تھا لے لیا گیا۔

جس مکان میں زندگی کے بہترین پینتیس سال بتائے تھے، جہاں بچوں کا جنم ہوا تھا، تعلیم ہوئی، شادیاں ہوئیں اسی گھر کو خیر باد کہہ کر بابو بالک رام مرحوم اہلیہ کی یادوں کو سمیٹے اس نئے فلیٹ میں چلے آئے۔

کچھ دنوں تک لڑکی کے ہاں ہی کھانا ہوتا رہا لیکن پھر بابو جی کو ایسا احساس ہونے لگا کہ لڑکی اور داماد کی تکلیف ایک طرف ان کی اپنی انفرادیت بھی معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ انھوں نے دو ٹوک لڑکی کو کہہ دیا کہ کسی روٹی بنانے والی کا انتظام کر دو۔

ایک دن دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنی لڑکی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک عورت کھڑی تھی ''مجھے کرشنا نے بھیجا ہے'' آپ کو کسی کام کرنے والی کی ضرورت ہے''

'' ہاں ہاں اندر آ جاؤ'' عورت کے داخل ہوتے ہی بابو بالک رام نے عورت کو سرتا پا دیکھا عمر ہوگی ۳۰ /۳۵ کو چھوتی ہوئی۔ دبلی پتلی مانگ میں سندور، تیکھے نقش، لیکن چہرے پر غربت کی پرچھائیاں سموئی ہوئی تھیں۔

'' جی کیا کام کرنا ہوگا'' '' یہ میرے پتا جی ہیں۔ یہ یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ میں اسی ٹاور کی پہلی منزل پہ رہتی ہوں۔ گھر کا پورا کام، جھاڑ پونچھ، صفائی، کپڑے دھونا، صبح کا ناشتہ اور دونوں وقت کا کھانا۔ بابو جی صبح نہا دھو کر پوجا پاٹ سے قریباً نو بجے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اسی وقت آ جانا۔ دوپہر کا کھانا کھلانے کے بعد گھر جا سکتی ہو۔ شام کو چائے اور رات کا کھانا کھلا کر چلے جانا''

''جی ٹھیک ہے اور میرا کھانا.......''

یہ الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھے کہ بابو جی بول اٹھے ''ارے بھائی کھانا پکاؤ گی تو کھانے کہیں اور جاؤ گی۔ صبح کا ناشتہ، دوپہر کا کھانا اور رات........

'' نہیں بابو جی رات کا کھانا آپ کو کھلا کر چلی جاؤں گی۔'' رات کا کھانا تو میں گھر پر ہی کھاؤں گی پورے پریوار کے ساتھ۔ میرا گھر والا ایک فیکٹری میں مزدوری کر کے شام کو گھر آ جاتا ہے۔ رات کا کھانا ہم سب مل کر ہی کھاتے ہیں۔

''کام اچھی طرح سے سمجھ لیا نا........ ہاں ! ماہانہ کیا لو گی۔''

بابو جی ابھی سے کیا بتاؤں۔ پندرہ دن تک کام کا ٹھیک اندازہ ہو جائے گا تو بتاؤں گی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کو میرا کام ہی پسند نہ آئے۔'' یہ سن کر بابو جی کے کان کھڑے ہو گئے۔ ان الفاظ میں اس کی خود اعتمادی کی جھلک صاف طور پر عیاں تھی۔

''ٹھیک ہے کل سے کام پر آ جانا'' ''اور تمہارا نام'' انیتا، انیتا بابو جی''

اگلے روز وہ پوجا پاٹ سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ کال بیل بجی۔ دروازہ کھولا سامنے انیتا کھڑی تھی۔

''ٹھیک ٹائم پر آئی ہوں نہ بابو جی''

اندر آ کر کیچن میں پلیٹ سے ڈھکے چائے سے بھرے کپ کو دیکھا ''بابو جی یہ چائے کیسی ہے''

''ارے بھائی صبح صبح مجھے چائے کی طلب ہوتی ہے۔ خود بنا لیتا ہوں۔ یہ تمہارے لیے ہے گرم کر کے پی لینا۔ میں ناشتے کے ساتھ چائے نہیں پیتا۔'' ''جی بابو جی میں ناشتے کے ساتھ ہی پیوں گی''

دن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ مجموعی طور پر انیتا کا کام بابو جی اور ان کی لڑکی کو پسند آیا۔ انیتا کو بھی کام میں دلچسپی ہو گئی۔ جتنے روپیوں کا انیتا نے تقاضہ کیا اسے بلا حیل وحجت منظور کر لیا گیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ انیتا جیسے سارے گھر کی مالکن ہی بن گئی کپڑے دھونا، انھیں پریس کے لیے دینا، انھیں ہینگر پر ترتیب سے رکھنا سب کام بخوبی سرانجام پاتے رہے۔

ادھر بڑھتی عمر کی وجہ سے بابو بالک رام کو نئی نئی بیماریوں نے آ گھیرا۔ ٹانگیں کمزور ہو گئیں اور ان میں لغزش کا احساس ہونے لگا۔ ایک دن انیتا کچھ جلدی ہی آ گئی تھی ابھی بابو جی نہانے کے لیے جا ہی رہے تھے۔ نہا کر اٹھتے وقت پاؤں ایسا پھسلا کہ اگر نلکے کی ٹوٹی پر ہاتھ نہ پڑتا تو بری طرح سے گر جاتے اور کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ جاتی۔ لیکن ٹوٹی کو پکڑنے کے باوجود قدم آگے نہ بڑھ سکے زور سے چلائے ''انیتا'' انیتا بھاگی ہوئی آئی بابو جی کو سہارا دے کر کرسی پر بٹھایا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ بابو بالک رام نے غسلخانے میں اپنی عریانیت کی وجہ سے نظر نیچی رکھی۔ انیتا اس واقع سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔

ایک دن بابو جی نے کسی انتہائی مصروف ڈاکٹر سے Appoinment لے رکھی تھی۔ گیارہ بجے گھر سے چل کر بارہ بجے تک وہاں پہنچنا تھا۔ انیتا کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم میں انیتا کا انتظار کرنے لگے۔ جسے ۹ بجے تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اتفاق سے اس دن ان کی لڑکی بھی باہر گئی ہوئی تھی۔ وقت گزرتا گیا نو سے دس، دس سے گیارہ لیکن انیتا کا کہیں نام ونشان نہیں۔ کوئی بارہ بجے جب ڈاکٹر کے ہاں جانے کا پروگرام منسوخ ہو چکا تھا۔ کال بیل بجی دروازہ کھولا تو سامنے انیتا کھڑی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی بابو جی کے غصے کا لاوا پھوٹ پڑا۔ انیتا نے کچھ بولنا چاہا کہ بابو جی پھر بھڑک اٹھے ''ڈاکٹر کوئی میرا نوکر ہے جو میرا انتظار کرتے'' غصے سے تھر تھر کانپتے ہوئے کپڑے بدلنے لگے اور زور سے چلائے ''اب کہیں ناشتہ بنانے نہ بیٹھ جانا سورج آسمان پر آ چکا ہے اب کھانا ہی بنانا'' غصے میں ہانپتے کانپتے بابو جی نے کھانا کھایا۔ شام کو انیتا آئی چائے پلائی اور کھانا بنا کر کیسرول میں رکھ دیا ''جاؤں بابو جی'' اجازت مانگنے میں کچھ تلخی تھی۔ بابو بالک رام نے بے رخی سے ہاں کہا اور انیتا چلی گئی۔

رات کو بستر پر دراز ہوتے ہی بابو بالک رام صبح کے واقع کو سوچ سوچ کر پریشان ہوئے تھے، بڑبڑاتے رہتے ''صبح میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ ہو سکتا ہے اس کی کوئی مجبوری ہو۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی لیکن میں نے اسے بولنے ہی کب دیا۔ ایک سوال جوان کو بار بار پریشان کر رہا تھا ''اگر وہ کام چھوڑ کر چلی گئی تو کیا ہو گا''

آنے والے کل کے خدشات کے پیش نظر ساری رات کروٹیں بدلتے رہے۔ صبح ہوئی بابو بالک رام نے

روزمرہ کی طرح چائے بنائی اپنے اور انیتا کے لیے۔ ظاہرہ پوجا پاٹ کر رہے تھے لیکن دھیان انیتا کی طرف ہی تھا۔ فارغ ہو کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کال بیل بجی دروازہ کھولا تو سامنے انیتا کھڑی تھی۔ بابو جی کی جان میں جان آئی۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا ''آج بہت جلدی آ گئی ہو'' حالانکہ انیتا اپنے ٹائم پر ہی آئی تھی۔ انیتا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے کام میں لگ گئی۔ ناشتہ لگا دیا۔ بابو جی کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن انیتا کی بے اعتنائی کے ہوتے کچھ بول نہ سکے اور الفاظ زبان کے نیچے دب کر ہی رہ گئے۔

انیتا اپنے روزمرہ کے کاموں میں منہمک تھی۔ دوپہر کو انیتا کی آواز آئی ''کھانا لگا رہی ہوں فارغ ہو جایئے'' بابو جی ہاتھ دھو کر کھانے کے لیے بیٹھے۔ انیتا کھانا پروس کر جانے لگی تو بابو جی کو کچھ کہنے کا موقع مل گیا۔ ''انیتا میں کل کچھ زیادہ ہی بول گیا تم کو غصہ تو آیا ہو گا'' بابو جی غصہ کیوں نہیں آتا غصہ تو جانوروں کو بھی آتا ہے۔ ہم تو انسان ہیں۔ لیکن ہر آدمی اپنا غصہ اپنے سے چھوٹے پر ہی نکالتا ہے، نئی بات کونسی ہے۔ لیکن بابو جی جب ہم لوگ روزی کی تلاش میں گھر سے نکلتے ہیں تو غصے کو طاق پر رکھ کر آتے ہیں بچوں کو جو پالنا ہوا۔''

''ہاں بابو جی جب آپ ملازمت کرتے تھے تو آپ کو بھی غصہ آیا ہو گا لیکن اپنی مجبوریوں سے اسے تھوک دیا ہو گا'' انیتا کی یہ بات سن کر بابو جی سہم گئے اور ان کی آنکھوں کے سامنے کئی سال پرانہ واقعہ نمودار ہو کر ان کا منہ چڑانے لگا۔ ''ایک معمولی سی غلطی پر ان کے باس نے سارے سٹاف کے سامنے اس قدر ذلیل کیا کہ وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ گھر واپس آتے ہوئے باس کے حقارت آمیز الفاظ ان کے کانوں میں گونجتے رہے اور وہ بڑبڑانے لگے ''نوکری کی کیا کمی تھی۔ میرے جیسے تجربے کار آدمی کو کوئی بھی ہاتھوں ہاتھ لے لے گا بہت ہو چکا اب اور ذلت برداشت کرنا ممکن نہیں۔ بس آج اس کمپنی میں آخری دن تھا کل صبح گھر سے ہی استعفےٰ لکھ کر لے جاؤں گا اور باس کے منہ پر دے ماروں گا۔'' اسی سوچ کو دامن میں لپیٹے گھر پہنچ گئے۔ گھنٹی بجائی دروازہ کھلا تو سامنے بیوی منہ لٹکائے کھڑی تھی۔ ''یہ اتنی اداس کیوں ہے ابھی تو میں نے اس سے کچھ کہا ہی نہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتے بیوی بول اٹھی ''ببلو کتنے دنوں سے بائک کے لیے کہہ رہا ہے۔ آپ ہمیشہ آج کل آج کل کہتے رہے۔ اس کے سب دوستوں کے پاس بائک ہے۔ آج بولتا اور بلکتا ہوا سو گیا ہے۔ اب تو بائک لے کر دینا ہی پڑے گا۔ بیوی کی بات سنتے سنتے وہ گھر میں داخل ہوئے کھانا کھایا سو گئے۔ صبح کا واقعہ اور ان کا ردِعمل بالکل دماغ سے نکل چکے تھے۔ صبح اٹھے اور روزمرہ کی طرح دفتر کے لیے روانہ ہو گئے۔

''کس سوچ میں پڑ گئے بابو جی۔ بات تو غصے کی ہو رہی تھی۔ ہمیں غصہ آتا ہے بہت آتا ہے لیکن پیٹ کی خاطر اسے تھوک دیتے ہیں۔ لیکن ایک بات تو ضرور ہے۔ بابو جی ہر انسان اپنے من ہی من مین ایک سیما بنا لیتا ہے۔ برداشت کی حد۔ کیا کہتے ہیں لکشمن ریکھا۔ جو ہی یہ لکشمن ریکھا پار ہوئی تو بس نہ ہم کام کی پرواہ کرتے ہیں نہ پیٹ کی۔ ٹھوکر مار کر اس گھر کی دہلیز کو الوداع کہتے دیتے ہیں اور پھر مڑ کر کبھی دیکھتے بھی نہیں۔

وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ بابو بالک رام کی بیماریوں میں اضافہ ہوتا گیا اور ڈاکٹروں کے ہاں کے چکر بھی بڑھ گئے۔ گرمیاں گزریں۔ برسات کا موسم خوب دھوم دھڑکے سے شروع ہو گیا۔ بدلتے موسم اور ہوا میں نمی کی وجہ سے بابو بالک رام کی سانس کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ سانس لینے میں بھی دقت

محسوس ہونے لگی۔inhellor کا استعمال شروع ہوگیا لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ تکلیف اور بڑھتی گئی۔ کسی نزدیکی دوست نے کسی چیسٹ اسپیشلسٹ کے بارے میں بتایا۔فون کیا تو کوئی ہفتہ بعد کی اپائمنٹ ملی ٹائم صبح نو بجے کا تھا۔مقررہ دن سے ایک دن پہلے جو جو ٹیسٹ اور علاج ہوئے ان کے کاغذات سنبھال لئے گئے اور انیتا کو بتا دیا کہ صبح آٹھ بجے سے کچھ پہلے ہی آجانا۔

بابو جی صبح کافی جلدی اٹھ گئے نہا دھو کر پوجا پاٹھ کر کے انیتا کا انتظار کرنے لگے۔ٹیکسی ڈرائیور نے فون کر کے بتایا کہ وہ ٹاور کے نیچے ہی کھڑا ہے اور گاڑی کا نمبر یہ ہے۔دروازہ کھلا تھا اور بابو رام کی آنکھیں دروازے پر لگی تھیں۔وال کلاک بتا رہا تھا کہ وقت آٹھ کو تجاوز کر چکا ہے کاغذ سنبھالے اور چابیاں لے کر دروازہ بند ہی کرنے والے تھے کہ انیتا آگئی۔

''بابو جی میرا بچہ......''

''.........کیا '' کہنے کو تو یہ الفاظ بابو جی کی زبان سے نکل گئے جو تیر کی مانند انیتا کو جا چبھے۔انیتا نے حقارت اور قہر آلود نظروں سے بابو بالک رام کو دیکھا۔بابو جی بغیر کچھ کہے انیتا کو چابیاں تھما کر جلدی سے نیچی نظریں کئے فلیٹ سے باہر نکل گئے اور ٹیکسی میں جا بیٹھے۔سارے رستے ایسا محسوس کرتے رہے جیسے انیتا کی شعلہ فگن نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی ہوں اور آنکھوں سے نکلے شعلے انھیں پگھلا کر رکھ دینگے۔

دوپہر کو تھکے ماندے گھر لوٹے لیکن انیتا سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہ کر سکے۔انیتا نے کھانا پروس دیا اور بغیر کچھ کہے چل دی۔شام کو بھی آئی چائے پلائی اور رات کا کھانا بنا کر رکھ کر چلدی۔جاتے جاتے انیتا نے ایک بار پھر بابو جی کو دیکھا گویا بابو بالک رام کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں لیکن پھر بھی وہ انیتا کی آنکھوں سے نکلے شعلوں کی تپش کو محسوس کر گئے۔

رسوئی گھر کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بابو بالک رام کے کانوں میں انیتا کے یہ الفاظ گونجنے لگے'' ہمیں غصہ آتا لیکن پیٹ کی خاطر اسے تھوک دیتے ہیں لیکن جب برداشت کی لکشمن ریکھا پار ہوتی ہے تو ہم نہ کام کی پرواہ کرتے ہیں نہ پیٹ کی ۔ٹھوکر مار کر اس گھر کو الوداع کہہ دیتے ہیں اور پھر مڑ کے دیکھتے بھی نہیں۔

بابو بالک رام لڑکھڑاتے قدموں سے کچن کی طرف بڑھے جہاں چائے سے لبالب پیالہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ پیالے کو اٹھا کر سنک میں ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ کانپتے ہاتھوں سے پیالہ چھوٹ کر فرش پر جا گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

بابو بالک رام کو ایسا لگا کہ جیسے پیالے کے ہر ٹکڑے سے انیتا کا عکس ان کا منہ چڑا رہا ہے اور کہہ رہا ہے ''بابو جی آپ نے لکشمن ریکھا پار کر ہی دی نا...''

☆☆☆

رہائی

از۔ایم مبین

دونوں چپ چاپ پولس اسٹیشن کے کونے میں رکھی ایک بنچ پر بیٹھے صاحب کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔انہیں وہاں بیٹھے تین گھنٹے ہوگئے تھے۔ دونوں میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ ایک دوسرے سے باتیں کریں ۔جب بھی دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور دونوں کی نظریں ملتیں تو وہ ایک دوسرے کو مجرم تصور کرتے۔

دونوں میں سے قصور کس کا تھا وہ خود ابھی تک یہ طے نہیں کر پائے تھے۔کبھی محسوس ہوتا وہ مجرم ہیں کبھی محسوس ہوتا جیسے ایک کے گناہ کی پاداش میں دوسرے کو سزا مل رہی ہے۔وقت گذاری کے لئے وہ اندر چل رہی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے۔ان کے لئے یہ جگہ بالکل اجنبی تھی۔دونوں کو یاد نہیں آرہا تھا کہ کبھی انہیں کسی کام سے بھی اس جگہ یا ایسی جگہ جانا پڑا تھا۔یا اگر کبھی جانا پڑا ہوگا تو بھی وہ مقام ایسا نہیں تھا۔

سامنے لاک اپ تھا۔ پانچ چھ آہنی سلاخوں والے دروازے اور ان دروازوں کے چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ہر کمرے میں آٹھ دس افراد بند تھے۔کوئی سو رہا تھا تو کوئی اونگھ رہا تھا' کوئی آپس میں باتیں کر رہا تھا تو کوئی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر کبھی انہیں تو کبھی پولس اسٹیشن میں آنے جانے والے سپاہیوں کو دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

ان میں سے کچھ کے چہرے اتنے بھیانک اور کرخت تھے کہ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ ان کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے ہے یا وہ خود جرائم پیشہ ہیں۔لیکن کچھ چہرے بالکل ان سے ملتے جلتے تھے۔معصوم بھولے بھالے۔سلاخوں کے پیچھے سے جھانک کر بار بار وہ انہیں دیکھ رہے تھے۔جیسے ان کے اندر تجسس جاگا ہے۔''تم لوگ شاید ہماری برادری سے تعلق رکھتے ہو۔تم لوگ یہاں کیسے آن پھنسے؟'' وہ جب بھی ان چہروں کو دیکھتے تو دل میں ایک ہی خیال آتا کہ صورت شکل سے تو یہ بھولے بھالے معصوم اور تعلیم یافتہ لوگ لگتے ہیں یہ کیسے اس جہنم میں آن پھنسے۔

باہر دروازے پر دو بندوق بردار پہرہ دے رہے تھے۔لاک اپ کے پاس بھی دو سپاہی بندوق لئے کھڑے تھے۔کونے والی میز پر ایک وردی والا مسلسل کچھ لکھ رہا تھا۔کبھی کوئی سپاہی آکر اس کی میز کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا تو وہ اپنا کام چھوڑ کر اس سے باتیں کرنے لگتا۔پھر اس کے جانے کے بعد اپنے کام میں مشغول ہو جاتا تھا۔

اس کے بازو میں ایک میز خالی پڑی تھی۔اس میز پر دونوں کے بریف کیس رکھے ہوئے تھے۔ان کے ساتھ اور بھی لوگ ریلوے اسٹیشن سے پکڑ کر لائے گئے تھے ان کا سامان بھی اسی میز پر رکھا ہوا تھا۔وہ لوگ بھی ان کے ساتھ ہی بنچ پر بیٹھے تھے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک دوسرے سے باتیں کر سکے۔ایک دو بار ان

میں سے کچھ لوگوں نے آپس میں باتیں کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی وقت سامنے کھڑا سپاہی گرج اٹھا۔

''اے خاموش! آواز مت نکالو شور مت کرو۔ اگر شور کیا تو لاک اپ میں ڈال دوں گا۔'' اس کے بعد ان لوگوں نے سرگوشی میں بھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ یا ممکن ہے ایک دوسرے کے شناسا ہوں جس طرح وہ اور اشوک ایک دوسرے کے شناسا تھے۔ نا صرف شناسا بلکہ دوست تھے۔ ایک ہی آفس میں برسوں سے کام کرتے تھے اور ایک ساتھ ہی اس مصیبت میں گرفتار ہوئے تھے۔

آج جب دونوں آفس سے نکلے تھے تو دونوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ اس طرح مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔

آفس سے نکلتے ہوئے اشوک نے کہا تھا۔ ''میرے ساتھ ذرا مارکیٹ چلو گے؟ ایک چھری کا سیٹ خریدنا ہے۔ بیوی کئی دنوں سے کہہ رہی ہے لیکن مصروفیات کی وجہ سے مارکیٹ تک جانا نہیں ہو رہا ہے۔''

''چلو!'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے سات بجے کی تیز لوکل پکڑنی ہے اور ابھی چھ بج رہے ہیں۔ اتنی دیر میں ہم یہ کام نپٹا سکتے ہیں۔'' وہ اشوک کے ساتھ مارکیٹ چلا گیا تھا۔

ایک دوکان سے انہوں نے چھریوں کا سیٹ خریدا تھا۔ اس سیٹ میں مختلف سائز کی آٹھ دس چھریاں تھیں۔ ان کی دھار بڑی تیز تھی اور دوکاندار کا دعویٰ تھا روزانہ استعمال کے بعد بھی دو سالوں تک ان کی دھار خراب نہیں ہوگی کیونکہ یہ اسٹین لیس اسٹیل کی بنی ہوئی ہیں قیمت بھی واجب تھی۔

قیمت ادا کر کے اشوک نے سیٹ اپنی اٹیچی میں رکھا اور وہ باتیں کرتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ اسٹیشن پہنچے تو سات بجنے میں بیس منٹ باقی تھے دونوں کی مطلوبہ تیز لوکل کے آنے میں پورے بیس منٹ باقی تھے۔

فاسٹ ٹرین کے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ نہیں تھی دھیمی گاڑیوں والے پلیٹ فارم پر زیادہ بھیڑ تھی لوگ شاید بیس منٹ تک کسی گاڑی کا انتظار کرنے کی بہ نسبت دھیمی گاڑیوں سے جانا پسند کر رہے تھے۔

اچانک وہ چونک پڑے۔ پلیٹ فارم پر پولس کی پوری فورس ابھر آئی تھی۔ اور اس نے پلیٹ فارم کے ہر فرد کو اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔ دو دو تین تین سپاہی آٹھ آٹھ دس دس افراد کو گھیرے میں لے لیتے ان سے پوچھ تاچھ کر کے ان کے سامان اور سوٹ کیس، اٹیچیوں کی تلاشی لیتے کوئی مشکوک مطلوبہ چیز نہ ملنے کی صورت میں انہیں جانے دیتے یا اگر انہیں کوئی مشکوک یا مطلوبہ چیز مل جاتی تو فوراً دو سپاہی اس شخص کو پکڑ کر پلیٹ فارم سے باہر کھڑی پولس جیپ میں بٹھا آتے۔

انہیں بھی تین سپاہیوں نے گھیر لیا تھا۔

''کیا بات ہے حولدار صاحب؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہ تلاشیاں کس لئے لی جا رہی ہیں؟''

''ہمیں پتہ چلا ہے کہ کچھ دہشت گرد اس وقت پلیٹ فارم سے اسلحہ لے جا رہے ہیں۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے یہ کاروائی کی جا رہی ہے۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

وہ کل آٹھ لوگ تھے جنہیں ان سپاہیوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا ان میں سے چار کی تلاشیاں ہو چکی تھیں اور انہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب اشوک کی باری تھی۔

جسمانی تلاشی لینے کے بعد اشوک کو بریف کیس کھولنے کے لئے کہا گیا۔ کھولتے ہی ایک دو چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد جیسے ہی ان کی نظریں چھریوں کے سیٹ پر پڑیں وہ اچھل پڑے۔ ''باپ رے اتنی چھریاں؟ صاب ہتھیار ملے ہیں۔'' ایک نے آواز دے کر تھوڑی دور کھڑے انسپکٹر کو بلایا۔

''حولدار صاحب یہ ہتھیار نہیں ہیں۔ سبزی ترکاری کاٹنے کی چھریوں کا سیٹ ہے۔'' اشوک نے گھبرائی ہوئی آواز میں انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''ہاں حولدار صاحب! یہ گھریلو استعمال کی چھریوں کا سیٹ ہے ہم نے ابھی بازار سے خریدا ہے۔'' اس نے بھی اشوک کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''تو تُو بھی اس کے ساتھ ہے تُو بھی اس کا ساتھی ہے؟'' کہتے ہوئے ایک سپاہی نے فوراً اسے دبوچ لیا۔ دو سپاہی تو پہلے ہی اشوک کو دبوچ چکے تھے۔ ''ہم سچ کہتے ہیں حولدار صاحب! یہ ہتھیار نہیں ہیں یہ گھریلو استعمال کی چھریوں کا سیٹ ہے۔'' اشوک نے ایک بار پھر ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''چپ بیٹھ!'' ایک زوردار ڈنڈا اس کے سر پر پڑا۔

''حولدار صاحب! آپ مار کیوں رہے ہیں؟'' اشوک نے احتجاج کیا۔

''ماریں نہیں تو کیا تیری پوجا کریں۔ یہ ہتھیار ساتھ میں لئے پھرتا ہے۔ دنگا فساد کرنے کا ارادہ ہے۔ ضرور تیرا تعلق ان دہشت پسندوں سے ہوگا۔'' ایک سپاہی بولا اور دو سپاہی اس پر ڈنڈے برسانے لگے۔ اس نے اشوک کو بچانے کی کوشش کی تو اس پر بھی ڈنڈے پڑنے لگے۔ اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ چپ رہے۔ دو چار ڈنڈے اس پر پڑنے کے بعد میں ہاتھ رک گیا۔ لیکن اشوک کا برا حال تھا۔ وہ جیسے ہی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولتا اس پر ڈنڈے برسنے لگتے اور مجبوراً اسے خاموش ہونا پڑتا۔

''کیا بات ہے؟'' اس درمیان انسپکٹر وہاں پہنچ گیا جسے انہوں نے آواز دی تھی۔

''صاب اس کے پاس ہتھیار ملے ہیں۔''

''اسے فوراً تھانے لے جاؤ۔'' انسپکٹر نے آرڈر دیا اور دوسری طرف بڑھ گیا۔ چار سپاہیوں نے انہیں پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے پلیٹ فارم سے باہر لے جانے لگے۔ باہر ایک پولس جیپ کھڑی تھی۔ اس جیپ میں انہیں بٹھا دیا گیا اس جیپ میں اور دو چار آدمی بیٹھے تھے۔ ان سب کو چار سپاہیوں نے اپنی حفاظت میں لے رکھا تھا۔ اسی وقت جیپ چل پڑی۔

''آپ لوگوں کو کس الزام میں گرفتار کیا گیا ہے؟'' جیسے ہی ان لوگوں میں سے ایک آدمی نے ان سے پوچھنے کی کوشش کی ایک سپاہی کا فولادی مکہ اس کے چہرے پر پڑا۔

''چپ چاپ بیٹھا رہ نہیں تو منہ توڑ دوں گا۔'' اس آدمی کے منہ سے خون نکل آیا تھا وہ اپنا منہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اور منہ سے نکلتے خون کو جیب سے رومال نکال کر صاف کرنے لگا۔

پولس اسٹیشن لاکر انہیں اس کونے کی بینچ پر بٹھا دیا گیا اور ان کا سامان اس میز پر رکھ دیا گیا جو شاید انسپکٹر کی تھی۔ جب وہ پولس اسٹیشن پہنچے تو مسلسل لکھنے والے نے لانے والے سپاہیوں سے پوچھا۔

''یہ لوگ کون ہیں؟ انہیں کہاں سے لا رہے ہو؟''

''ریلوے اسٹیشن پر چھاپے کے دوران پکڑے گئے ہیں ان کے پاس سے مشکوک چیزیں یا ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔''

''پھر انہیں یہاں کیوں بٹھا رہے ہو؟ انہیں لاک اپ میں ڈال دو۔''

''صاحب نے کہا ہے کہ انہیں باہر بٹھا کر رکھو وہ آکر ان کے بارے میں فیصلہ کریں گے۔'' بینچ پر بٹھانے سے پہلے ان کی اچھی طرح تلاشی لی گئی تھی۔ کوئی مشکوک چیز برآمد نہیں ہوئی یہی غنیمت تھا۔ ان کی پولس اسٹیشن آمد کی تھوڑی دیر بعد دوسرا جتھا پولس اسٹیشن پہنچا۔ وہ بھی آٹھ دس لوگ تھے شاید انہیں کسی دوسرے انسپکٹر نے پکڑا تھا اس لئے انہیں دوسرے کمرے میں بٹھایا گیا۔ اور بھی اس طرح کے کتنے لوگ لائے گئے انہیں اندازہ نہیں تھا کیونکہ وہ صرف اس کمرے کی سرگرمیاں دیکھ پا رہے تھے جس میں وہ مقید تھے۔

نئے سپاہی آتے تو ان پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر اپنے دوسرے ساتھیوں سے پوچھ لیتے۔ ''یہ کہاں سے پکڑے گئے ہیں۔ جُوئے گھر سے، بلیو فلم دیکھتے ہوئے یا طوائفوں کے اڈوں سے؟''

''ہتھیاروں کی تلاش میں۔ آج ریلوے اسٹیشن پر چھاپا مارا تھا۔ وہاں پر پکڑے گئے ہیں۔''

''کیا کچھ برآمد ہوا؟''

''خاطر خواہ تو کچھ بھی برآمد نہیں ہو سکا۔ تلاش جاری ہے۔ صاب ابھی نہیں آئے ہیں۔ آئیں تو پتہ چلے گا کہ خبر صحیح تھی یا غلط اور اس چھاپے سے کچھ حاصل ہوا ہے یا نہیں؟''

جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اشوک کی حالت غیر تھی۔ اس کے چہرے پر اس کے دل کی کیفیت ابھر رہی تھی۔ ہر لمحہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی چکرا کر گر جائے گا۔ اسے اندازہ تھا جن خدشات سے وہ ڈر رہا ہے اشوک کے خدشات کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔ اسے اس بات کا اطمینان تھا تلاشی میں اس کے پاس سے کوئی بھی مشکوک چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے نہ تو پولس اس پر کوئی الزام لگا سکتی ہے نہ اس پر ہاتھ ڈال سکتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ اشوک کے ساتھ گرفتار ہوا ہے۔ اشوک پر جو بھی فردِ جرم عائد کی جائے گی اس میں اسے بھی برابر کا شریک قرار دیا جائے گا۔ کبھی کبھی اسے غصہ آ جاتا۔

''آخر ہمیں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟ کس جرم میں ہمارے ساتھ عادی مجرموں سا ذلت آمیز سلوک کیا جا رہا ہے اور یہاں گھنٹوں سے بٹھا کر رکھا گیا ہے اور ہماری تذلیل کی جا رہی ہے؟ ہمارے پاس سے تو ایسی کوئی مشکوک قابل اعتراض چیز برآمد نہیں ہوئی ہے۔ وہ چھریوں کا سیٹ؟ وہ تو گھریلو استعمال کی چیزیں ہیں۔ انہیں اپنے پاس رکھنا یا کہیں لے جانا کوئی جرم نہیں ہے۔ اشوک ان چیزوں سے کوئی قتل و غارت گری یا دنگا فساد نہیں کرنا چاہتا تھا وہ تو انہیں اپنے گھر اپنے گھریلو استعمال کے لئے لے جانا چاہتا تھا۔'' لیکن وہ کس سے یہ باتیں کہے، کس کے سامنے اپنی بے گناہی کی صفائی پیش کرے۔ یہاں تو آواز بھی منہ سے نکلتی ہے تو جواب میں کبھی

گالیاں ملتی ہیں تو کبھی گھونسے۔ اس مصیبت سے کس طرح نجات پائیں دونوں اپنی اپنی طور پر سوچ رہے تھے جب ان سوچوں سے گھبرا جاتے تو سرگوشی میں ایک دوسرے سے ایک دو باتیں کر لیتے۔

''انور اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا اشوک! تم حوصلہ رکھو۔ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔''

''پھر ہمیں یہاں یوں کیوں بٹھا کر رکھا گیا ہے۔ ہمارے ساتھ عادی مجرموں کا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے؟''

''یہاں کے طور طریقے ایسے ہی ہیں۔ ابھی ہمارا کیس کسی کے سامنے گیا بھی نہیں ہے۔''

''میرا سالہ مقامی ایم۔ ایل۔ اے کا دوست ہے۔ اسے فون کر کے تمام باتیں بتا دوں گا وہ ہمیں اس جہنم سے نجات دلا دے گا۔''

''پہلی بات تو یہ لوگ ہمیں فون کرنے نہیں دیں گے۔ پھر تھوڑا حوصلہ رکھو انسپکٹر کے آنے کے بعد کیا صورت حال پیدا ہوتی ہے اس وقت اس بارے میں سوچیں گے۔''

''اتنی دیر ہو گئی گھر نہ پہنچنے پر بیوی متفکر ہوگی۔''

''میری بھی یہی حالت ہے۔ ایک دو گھنٹے لیٹ ہو جاتا ہوں تو وہ گھبرا جاتی ہے۔ ان لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں کچھ نہ ملنے کی صورت میں کسی بھی الزام میں پھنسا دیں گے۔''

''ارے سب ان کا پیسہ کھانے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا گیا ہے۔'' بغل میں بیٹھا آدمی ان کی سرگوشیوں کی باتیں سن کر پھسپھسایا۔ ''کڑکی لگی ہوئی ہے کسی مجرم سے ہفتہ نہیں ملا ہوگا یا اس نے ہفتہ دینے سے انکار کر دیا ہوگا۔ اس کے خلاف تو کچھ نہیں کر سکتے اس کی بھرپائی کرنے کے لئے ہم شریفوں کو پکڑا گیا ہے۔''

''تمہارے پاس کیا ملا؟'' اس نے پلٹ کر اس آدمی سے پوچھا۔

''تیزاب کی بوتل۔'' وہ آدمی بولا۔ ''اس تیزاب سے میں اپنے بیمار باپ کے کپڑے دھوتا ہوں جو کئی مہینوں سے بستر پر ہے۔ اس کی بیماری کے جراثیم مر جائیں ان سے کسی اور کو نقصان نہ پہنچے اس کے لئے ڈاکٹر نے اس کے سارے کپڑے اس ایسڈ میں دھونے کے لئے کہا ہے۔ آج ایسڈ ختم ہو گیا تھا وہ میڈیکل اسٹور سے خرید کر لے جا رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا اس مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ ورنہ میں اپنے گھر کے قریب کے میڈیکل اسٹور سے خرید لیتا۔''

''اے! کیا کھسر پسر چالو ہے؟'' ان کی سرگوشیاں سن کر ایک سپاہی دہاڑا تو وہ سہم کر چپ ہو گئے۔ ذہن میں پھر وسوسے سر اٹھانے لگے۔ اگر اشوک پر کوئی فردِ جرم عائد کر کے گرفتار کر لیا گیا تو اسے بھی بخشا نہیں جائے گا۔ اشوک کی مدد کرنے والا ساتھی اسے قرار دے کر اس پر بھی وہی فردِ جرم عائد کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ پولس تو ان پر فردِ جرم عائد کر کے انہیں عدالت میں پیش کر دے گی۔ انہیں عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہوگی۔ اور اس بے گناہی کو ثابت کرنے میں سالوں لگ جائیں گے۔ سالوں عدالت کچہری کے چکر۔ اس تصور سے ہی اس کو جھرجھری آ گئی۔ پھر لوگ کیا کہیں گے کس کس کو وہ اپنی بے گناہی کی داستان سنا کر اپنی صفائی پیش کریں گے۔

اگر پولس نے ان پر فرد جرم عائد کی تو معاملہ صرف عدالت تک محدود نہیں رہے گا۔ پولس ان کے

بارے میں بڑھا چڑھا کر اخبارات میں بھی ان کے جرم کی کہانی چھپوا دے گی۔ اخبار والے تو اس طرح کی کہانیوں کی تاک میں ہی رہتے ہیں۔

''دو سفید پوشوں کے کالے کارنامے۔''

''ایک آفس میں کام کرنے والے دو کلرک دہشت گردوں کے ساتھی نکلے۔''

''ایک بدنام زمانہ گینگ سے تعلق رکھنے والے دو غنڈے گرفتار۔''

''فساد کرنے کے لئے ہتھیار لے جاتے ہوئے دو غنڈے گرفتار۔''

''شہر کے دو شریف باشندوں کا تعلق خطرناک دہشت پسندوں سے نکلا۔'' ان باتوں کو سوچ کر وہ اپنا سر پکڑ لیتا۔ جیسے جیسے وقت گذر رہا تھا۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی اور اسے ان باتوں خیالوں سے نجات حاصل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

گیارہ بجے کے قریب انسپکٹر آیا وہ غصے میں بھرا تھا۔

''نالائق، پاجی، حرامی، سالے کچھ بھی جھوٹی اطلاعیں دے کر ہمارا وقت خراب کرتے ہیں۔ اطلاع ہے کہ دہشت گرد ریلوے اسٹیشن سے خطرناک اسلحہ لے کر جانے والے ہیں۔ کہاں ہیں دہشت گرد، کہاں ہے اسلحہ؟ چار گھنٹے ریلوے اسٹیشن پر مغز پاشی کرنی پڑی۔ رامو یہ کون لوگ ہیں؟''

''نہیں ریلوے اسٹیشن پر شک میں گرفتار کیا گیا تھا۔''

''ایک ایک کو میرے پاس بھیجو۔''

ایک ایک آدمی اٹھ کر انسپکٹر کے پاس جانے لگا اور سپاہی اسے بتانے لگے کہ اس شخص کو کس لئے گرفتار کیا گیا ہے۔

''اس کے پاس سے تیزاب کی بوتل ملی ہے۔''

''صاحب! وہ تیزاب مہلک نہیں ہے۔ اس سے میں اپنے بیمار باپ کے کپڑے دھوتا ہوں۔ وہ میں نے ایک میڈیکل اسٹور سے خریدی تھی۔ اس کی رسید بھی میرے پاس ہے اور جس ڈاکٹر نے یہ لکھ کر دی ہے اس ڈاکٹر کی چٹھی بھی۔ یہ جراثیم کش تیزاب ہے۔ برف کی طرح ٹھنڈا۔'' وہ شخص اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''جانتے ہو تیزاب لے کر لوکل میں سفر کرنا جرم ہے؟''

''جانتا ہوں صاحب! لیکن یہ تیزاب آگ لگانے والا نہیں ہے۔''

''زیادہ منہ زوری مت کرو۔ تمہارے پاس تیزاب ملا ہے۔ ہم تمہیں تیزاب لے کر سفر کرنے کے جرم میں گرفتار کر سکتے ہیں۔''

''اب میں کیا کہوں صاحب!'' وہ آدمی بے بسی سے انسپکٹر کا منہ تکنے لگا۔

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو لیکن آئندہ تیزاب لے کر ٹرین میں سفر نہیں کرنا۔''

''نہیں صاحب! اب تو ایسی غلطی پھر کبھی نہیں ہوگی۔'' کہتا ہوا وہ آدمی اپنا سامان اٹھا کر تیزی سے پولس اسٹیشن کے باہر چلا گیا۔

اب اشوک کی باری تھی۔

''ہم دونوں ایک کمپنی کے سیلس ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔ یہ ہمارے کارڈ ہیں۔ کہتے اشوک نے اپنا کارڈ دکھایا میں نے یہ چھریوں کا سیٹ گھریلو استعمال کے لئے خریدا تھا اور گھر لے جا رہا تھا۔ آپ خود دیکھئے یہ گھریلو استعمال کی چھریاں ہیں۔

''صاب ان کی دھار بہت تیز ہے۔'' درمیان میں سپاہی بول اٹھا۔

انسپکٹر ایک ایک چھری اٹھا کر اس کی دھار پرکھنے لگا۔

''سچ مچ ان کی دھار بہت تیز ہے۔ ان کے ایک ہی وار سے کسی کی جان بھی لی جا سکتی ہے۔''

''اس بارے میں میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب!'' اشوک بولا۔ ''کمپنی نے اس طرح کی دھار بنائی ہے۔ کمپنی کو اتنی تیز دھار والی گھریلو استعمال کی چھریاں نہیں بنانی چاہیئے۔''

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔ انسپکٹر اشوک سے بولا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''تم؟''

''صاحب! یہ اس کے ساتھ تھا۔''

''تم بھی جا سکتے ہو لیکن سنو۔'' اس نے اشوک کو روکا۔ پورے شہر میں اس طرح کی تلاشیاں چل رہی ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد ممکن ہے تم ان چھریوں کی وجہ سے کسی اور جگہ دھر لئے جاؤ۔''

''نہیں انسپکٹر صاحب! اب مجھ میں یہ چھریاں لے جانے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اسے یہیں چھوڑے جاتا ہوں۔'' اشوک بولا تو انسپکٹر اور سپاہی کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

وہ دونوں اپنے اپنے بریف کیس اٹھا کر پولس اسٹیشن کے باہر آئے تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں جہنم سے رہائی کا حکم مل گیا ہے۔

●●

رابطہ
ایم مبین، موبائل:۔ 9322338918

ڈاکٹر منصور خوشتر کی مرتبہ کتاب
بہار میں اُردو صحافت، سمت و رفتار
جامع اور مستند کتاب۔ مجلد۔ صفحات ۳۲۰۔ قیمت۔ ۲۰۰/روپے
رابطہ
ڈاکٹر منصور خوشتر۔ موبائل نمبر 09234772764

سستا لہو

وحشی سعید۔ کشمیر

''منوں آج تم شہر جا رہے ہو۔ کالج میں ٹھیک سے پڑھائی کرنا۔ تمھیں بڑا آدمی بننا ہے بیٹا۔ آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو......خیر....ارے یار بس کرو۔ بیٹا پہلی بار شہر پڑھائی کے لیے جا رہا ہے۔ اس کو ہنسی خوشی رخصت کرو۔ ہاں.... ہاں.... بیٹا ایک بات یاد رکھنا کہ میرا تمہارے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔ باپ بیٹے گلے ملے اختر خان نے اس کا سامان اس کی برتھ پر رکھا اور ریل گاڑی نے سیٹی دے دی۔ اختر خان اور منوں کے والد گاڑی سے اتر گئے اور منوں اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ خان منوں کب واپس آئے گا۔ ارے یار بتایا تو ہے کم از کم ایک سال کے بعد۔ ویسے بی اے کا کورس تو تین سال کا ہوتا ہے لیکن ہر سال دو ماہ کی چھٹی بھی ہوتی ہے۔ دو سال میں چار ماہ تو وہ یہیں رہے گا اور تیسرے سال پڑھائی پوری کر کے بڑا افسر بن جائے گا تو تم اس کے پاس ہمیشہ کے لیے رہو گے۔ خان، جب منوں بڑا افسر بن جائے گا تو میں تیری بیٹی سے اس کا نکاح کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ منوں! جس کا اصل نام اقبال تھا پہلے بھی کئی بار شہر آ چکا تھا' لیکن شہر کی زندگی اسے پسند نہیں تھی' وہ گاؤں کا سیدھا سادھا نوجوان تھا۔ شہر کی گندگی سے دور.. ہاسٹل میں اپنا سامان رکھنے کے بعد وہ پڑھائی میں گم ہو گیا۔ اس کے کمرے میں ایک طالب علم تھا جس کا نام جمال علی تھا۔ وہ امیر باپ کا بیٹا تھا۔ اسی شہر کا رہنے والا۔ ''احسن ویلا'' جو اس کے شاندار مکان کا نام تھا ' کے ہوتے ہوئے اس نے ہاسٹل میں بھی مسکن بنایا ہوا تھا۔ دراصل اپنے شراب و شباب کے شوق وہ اسی کمرے میں پورے کرتا تھا۔ لیکن اقبال کو ان سب چیزوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس کا سفر کالج سے ہاسٹل تک محدود تھا۔ وہ غریب باپ کا غریب بیٹا تھا۔ اسے تو اسی بات کا فخر تھا کہ جمال علی اسے بھائی مانتا ہے۔ حالانکہ جمال علی کی نظروں میں وہ ایک غریب دیہاتی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے وہ اپنے بہت سے کام اقبال سے کرواتا تھا اور کبھی کبھی غریب سمجھ کر کچھ پیسے بھی اس کی جیب میں ڈال دیتا تھا۔ ایک دن جمال علی کو اپنا کچھ سامان گھر سے ہاسٹل لانا تھا۔ اس نے اقبال کو ساتھ لیا اور اپنے گھر پہنچ گیا۔ ''احسن ویلا'' دیکھ کر اقبال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''ہاں'' اقبال دیکھو.. یہ سارا سامان تم اپنی پیٹھ پر رکھ لو اور باہر سے رکشہ کر لینا اور کمرے میں سارا سامان بہ حفاظت رکھ دینا۔ میں شام کو آؤں گا۔ جی بھائی۔ اقبال سامان کو اپنی پیٹھ پر رکھنے جا ہی رہا تھا کہ جمال علی کی بہن جس کی عمر تقریباً ۳۰ سال تھی اور جس کا خاوند چار ماہ پہلے ہی فوت ہو چکا تھا آ گئی۔ اقبال کے خوبصورت جسم کو دیکھ کر اس کے بدن میں ہوس کے شعلے جاگ اٹھے۔ تم کون ہو۔ جی.... جی.... میں....وہ جمال بھائی کے ساتھ آیا تھا۔ میں اور وہ ہاسٹل میں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ سامان اٹھا کر کمرے میں پہنچا دوں۔ ٹھیک ہے۔ سارا سامان یہی ہے کہ چھوٹا بھی ہے۔ مجھ سے تو انھوں نے یہی کہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ ایسا کرنا کہ تم کل پھر آ جانا۔ یہ لو پیسے اور بازار سے مٹھائی اور پھل لیتے آنا۔ جی..

دوسرے دن جب وہ احسن ویلا پہنچا تو جمال کی بہن اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ یہاں مٹھائی اور پھل رکھ دو۔ اور آؤ میرے پاس بیٹھ کر اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ جی، میں، ہاں ہاں آؤ بیٹھو۔ گھبراؤ نہیں، اس نے اقبال کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا اور اس کے پیروں پر اپنے پیر رکھ دئے۔ اچھا یہ بتاؤ میں خوبصورت ہوں' جی....جی....آپ تو بہت خوبصورت ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تمہیں میرے چہرے میں سب سے زیادہ خوبصورت کیا لگتا ہے۔ جی....جی... آپ کے کانوں کے بالے۔ یہ سونے کے ہیں نا۔ ہاں سونے کے ہیں۔ لیکن یہ تمہیں کیوں سب سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ جی وہ...جی وہ...جب میں بڑا آدمی بن جاؤں گا اور میری شادی ہو گی تو میں اپنی دلہن کے لیے اسی طرح کے سونے کے بالے خریدوں گا۔ اقبال نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔ اس دیہاتی نے جوانی کا کچھ سبق سیکھا ہے یا شہر میں آ کر بھی پوری طرح گاؤں کا دیہاتی ہی رہا۔ وہ من ہی من میں بڑبڑائی۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ جمال علی وہاں آ گیا۔ ارے اقبال تم یہاں کیسے ؟ جمال نے حقارت سے پوچھا۔ وہ...وہ... بھیا کل میں نے اس سے مٹھائی اور پھل منگوائے تھے یہ لے کر آیا ہے تو میں نے ہی اسے روک لیا کہ اس سے اس کے گاؤں کی کچھ باتیں کروں۔ جمال کی بہن نے اس کی نظر بچا کر اپنا پیر جمال کے پیر سے دھیرے سے ہٹا لیا۔ ٹھیک ہے لیکن بہن تم اس سے پھر کبھی باتیں کرنا۔ ابھی مجھے اسے لے کر کہیں جانا ہے۔ ہاں اقبال تم نیچے بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ جی بھائی۔ اقبال کے جانے کے بعد اس نے اپنی بہن سے سخت لہجے میں کہا ''آپ اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہیں' اور دیہاتی غریب کو اپنے بیڈروم تک لے آئیں۔۔ وہ بھیا مٹھائی اور پھل رکھنے تھے نا۔ ٹھیک ہے لیکن آئندہ اسے مت بلانا۔ میں بھی خیال رکھوں گا کہ یہ گھر کبھی نہ آنے پائے۔ بی اے کے آخری سال کا نتیجہ آیا تو اقبال خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ اول نمبروں سے پاس ہوا تھا۔ جمال علی فیل ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے والد نے اسے کاروبار سنبھالنے کے لیے کالج سے نکال لیا۔ وہ ہاسٹل آ کر گاؤں جانے کے لیے سامان باندھ ہی رہا تھا کہ ڈاکیہ خط لے کر آیا۔ خط میں لکھا تھا ''فوراً گھر چلے آؤ۔ تمہارے والد بہت بیمار ہیں۔ جب وہ گاؤں پہنچا تو والد نہیں ملے۔ بلکہ ان کی قبر ملی۔ وہ زار و قطار رویا پھر والد کا خواب پورا کرنے کے لیے شہر آ گیا۔ لیکن اب اس پر زندگی کی اصلی حقیقت آشکار ہو چکی تھی۔ اول درجے کی ڈگری کے باوجود اسے نوکری نہیں مل رہی تھی۔ ہر جگہ سفارش، صلاحیت کی کوئی قدر نہیں۔ دھیرے دھیرے اس کے پیسے ختم ہو گئے اور فاقوں کی نوبت آ گئی۔ دو دن بھوکا رہنے کے بعد اس کے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ احسن ویلا چلوں۔ وہاں جمال بھائی کی سفارش سے کوئی نہ کوئی نوکری مل ہی جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا اور تیز قدموں سے احسن ویلا کی جانب چل پڑا۔ ارے تم تو.....وہ.....جمال کی بہن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ جی ہاں ..میں اقبال ہوں اور جمال بھائی سے مدد مانگنے آیا ہوں۔ اگر وہ سفارش کر دیں تو مجھے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی۔ لیکن جمال تو یہاں نہیں ہے۔ وہ لندن گیا ہوا ہے۔ تو پھر.......وہ مایوسی سے پلٹنے لگا۔ لیکن رکو۔ جاتے کہاں ہو؟ جمال نہیں ہے تو کیا ہوا اس کی بہن تو ہے۔ لیکن پہلے تم کھانا کھاؤ۔ لگتا ہے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا۔ اقبال کھانے پر بھی شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔ کھانے سے فارغ ہوا تو جمال کی بہن اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ تمہاری شادی ہو گئی...نہیں... تمہیں معلوم ہے شادی کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اقبال شرما گیا ارے ایک لڑکا اور ایک لڑکی دو جسم ایک جان ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کا نام لے کر پکارتے ہیں۔ جیسے تمہارا نام

اقبال اور میرا نام نجمہ۔شادی میں جہیز بھی ملتا ہے۔ بیڈ۔ زیور۔تم نے میرا بیڈ دیکھا۔آؤ میں دکھاتی ہوں ۔ وہ اس کا بازو پکڑ کر بیڈ کے پاس لے گئی اور زبردستی اسے لٹا دیا۔کیسا لگ رہا ہے۔ یہ تو نرم ہے اس پر سونے کے بعد کوئی بھی خوابوں کی سیر کرنے لگتا ہوگا۔ تمھیں اس پر سلا کر خوابوں کی سیر بھی کراؤں گی لیکن اس سے پہلے تم میرے نرم جسم کی سیر تو کرلو۔ یہ کہہ کر وہ اقبال پر بھوکی شیرنی کی طرح ٹوٹ پڑی۔اس کے نرم جسم کے لمس سے اقبال کا جسم بھی دہکنے لگا۔دونوں نے اپنے کپڑے اتار پھینکے۔دو گھنٹے تک ایک دوسرے کے جسم سے جدو جہد کے بعد اقبال نے اٹھ کر کپڑے پہنے۔ نجمہ برہنہ ہی بیڈ پر پڑی رہی ۔ایسا لگتا تھا کہ اس کی بھرپور پیاس آج ہی بجھی تھی ۔اس نے اقبال کے جسم کے ہر عضو سے رس نچوڑ لیا تھا اور نڈھال پڑی تھی۔ جب اقبال جانے لگا تو وہ برہنہ ہی اٹھی اپنے جسم کو اس کے جسم سے چمٹا کر اس کے ہونٹوں پر بھرپور بوسہ دیتے ہوئے اس کی قمیص کی جیب میں ۵۰ روپئے ڈالتے ہوئے بولی۔

''اگر تم ۵۰ روپئے روز کمانا چاہتے ہو تو میرے پاس آجانا۔'' اب اقبال کی راتیں روز رنگین ہونے لگیں نجمہ اس کی بھرپور جوانی کا رس پی کر خود کو سیراب کر رہی تھی ۔ ٦ ماہ تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔اقبال کافی کمزور ہو گیا تھا ایک دن وہ نجمہ کی ہوس پوری کرنے کے بعد سیڑھیوں سے نیچے اتر ہی رہا تھا کہ جمال علی آ گیا۔ارے اقبال تم یہاں ۔ہاں بھائی وہ....اچھا تم یہاں بیٹھو....میں ابھی آتا ہوں ۔وہ دیہاتی ذلیل یہاں کیوں آیا تھا جب کہ میں نے تم سے تین سال پہلے ہی منا کیا تھا کہ یہ بھکاری دوبارہ یہاں نہ آنے پائے ۔ میں کیا کرتی بھیا۔ یہ تو چھ ماہ سے آرہا ہے۔تمہارا دوست تھا تمہیں ڈھونڈتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ بے روزگار ہوں کہیں سفارش کر کے نوکری دلوا دیجئے۔اب بھلا میں کیا کرتی ۔روز تمہیں پوچھتا ہوا آتا ہے اور بے کاری کا رونا روتا ہے تو میں بھکاری سمجھ کر دس بیس روپئے تمہارا صدقہ اسے دے دیتی ہوں ۔اقبال نیچے کھڑا یہ سب سن رہا تھا ۔اسے یقین نہیں آیا۔ایسا لگتا تھا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔پورا جسم مانو شل ہو گیا تھا۔

جس جمال کو وہ بھائی کہتا تھا۔اس کا ہر کام کرتا تھا۔وہ اسے بھکاری سمجھتا تھا۔دوسرے ہی پل اس نے اپنے ہوش پر قابو پایا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ بدحواسی کی حالت میں وہ چوراہے تک پہنچا کہ یکا یک اسے محسوس ہوا کہ آسمان چکر کھا رہا ہے زمین اور مکان گھوم رہے ہیں۔

وہ گر پڑا۔اور ایسا گرا کہ دوبارہ نہ اٹھ سکا۔ایک گاڑی اسے ٹکر مارتی ہوئی تیز رفتار سے جا چکی تھی۔ رات بھر اس کا خون سے سنا ہوا مردہ جسم سڑک پر پڑا رہا۔صبح میونسپیلٹی کی گاڑی لاش کو اٹھا لے گئی اس جگہ دفنانے کے لیے جہاں اس کے جیسے بہت سے سستے لہو کے مالک دفن تھے۔

☆☆☆

افسانہ ''سستا لہو کا تجزیہ''

شارق عدیل

وحشی سعید' کی کہانیاں اپنے ہی انداز سے قرطاس پر قدم رکھتی ہیں اور اختتام کی منزل میں پہنچ کر تو اس قدر پر اثر ہو جاتی ہیں کہ قاری دیر تک انھیں سوچتا رہتا ہے۔ ''سستا لہو'' وحشی سعید کی جو دولت اور غربت دونوں کی فراوانی کی چھاؤں میں ایک دولت مند بیوہ کی چنگھاڑتی ہوئی جسمانی خواہشات کا احاطہ کرتے ہوئے یہ باور کراتی ہے کہ دولت کی بہتات بھی انسان کو گمراہ کر دیتی ہے ۔اور اس کے برعکس غربت کی ستم ظریفی بھی انسان کو ایسے کاموں پر آمادہ کر لیتی ہے جنھیں وہ کرنا نہیں چاہتا۔ سستا لہو ، کے کرداروں میں صرف تین نام ہی اہم ہیں 'اقبال' جس کی زندگی پوری طرح اندھیرے میں ڈوبی ہوئی ہے۔لیکن اقبال اپنے اندر یہ امید بھی پالے ہوئے ہے کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے کوئی معقول نوکری مل جائے گی ۔دوسرا کردار جمال علی کا ہے جو ایک امیر کبیر تجارتی انسان کی عیاش مزاج اولاد ہے اس لیے وہ دولت کے ہر ناجائز استعمال سے واقف ہے اور اس کی نظروں میں تعلیم کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے۔اور تیسرا کردار جمال علی کی بہن نجمہ کا ہے جو اقبال کے مظبوط کسرتی جسم کو اپنی ہوس گزیدہ نظروں سے چاٹتی رہتی ہے۔

وحشی سعید نے کہانی کے مذکورہ کرداروں کو اپنے ذہن میں رکھ کر جو کہانی کا روپ عطا کیا ہے اس کا آخری منظر بہت ہی عبرت ناک ہے۔لیکن اس کہانی کا عنوان ''سستا لہو'' کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو زیادہ بہتر تھا ،ممکن ہے وحشی سعید نے مذکورہ عنوان سے قارئین کو چونکانے کی کوشش کی ہو کیونکہ امیری اچھا خاندان ہونے کی ضمانت نہیں ہے اور نہ ہی غریبی غیر اہم خاندان ہونے کی علامت ہے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس دنیا کو کرشمات سے منور کرنے والے بیشتر لوگ غریبی کی گلی کے رہنے والے ہی ہیں اس لیے غریبی کی بنا پر کسی کے خون کو ''سستا لہو'' کا عنوان نہیں دیا جا سکتا۔اب کہانی کے ایک ایسے منظر کو ملاحظہ فرمائیں جو امیری اور غریبی کے فرق کو بیان کرنے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ جمال علی کو اپنا کچھ سامان اپنے گھر سے کالج کے ہوسٹل میں لانا تھا اس لیے اس نے اقبال کو ساتھ لیا اور اپنے گھر پہنچ گیا' اس کے محل نما گھر کو دیکھ کر اقبال کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اقبال' جمال علی کی ہدایت پر سامان اٹھانے کے عمل سے گزرنے ہی والا تھا کہ جمال علی کی بہن آ گئی جس کی عمر تقریباً تیس سال تھی اور اس کا خاوند فوت ہو چکا تھا۔اقبال کے کسے ہوئے خوبصورت جسم کو دیکھ کر اس کے اندر جنسی خواہشات کروٹیں بدلنے لگتی ہیں اور وہ تنہائی میں اس کی قربتیں حاصل کرنے کے منصوبے بنانے لگتی ہے۔

کہانی کا یہ منظر رئیس زادیوں کی بے اعتدالیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ دولت کی بے تحاشہ فراوانی نے امیروں کی عورتوں کو بھی مردوں کا ہم قدم بنا دیا ہے۔ جبکہ فطرتاً عورت عیاش نہیں ہوتی ۔لیکن امیر زادوں کی عیاشیوں نے اسے بھی جنسی لذّتوں کا اسیر بنا دیا ہے اور وہ یہ بھولتی جا رہی ہے کہ اس کے اندر ایک

ماں بھی رہتی ہے۔ جس کے جذبات ممتا اور پاکیزگی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ رئیس زادے اپنی بداعمالی پر قابو رکھیں تاکہ ان کی بہنیں ان کے اعلیٰ اور شفاف کردار سے پاکیزگی حاصل کریں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں کیونکہ عورت کا اٹھایا ہوا ایک غلط قدم پورے خاندان کو رسوائی کی غار میں ڈھکیل سکتا ہے جس کا خمیازہ کئی نسلوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

کہانی ایک بار پھر اپنے مرکز کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اور جمال علی کی بہن کی عیاش فطرت کو نمایاں کرنے لگتی ہے۔ مثلاً 'اقبال کے جانے کے بعد جمال علی نے اپنی بہن کو سخت لہجے میں ڈانٹتے ہوئے تاکید کی ''آپ اتنے بڑے گھر کی بیٹی ہیں' اور اس غریب دیہاتی کو اپنے بیڈروم تک لے آئیں'' لیکن جمال علی نے اپنی بہن کو سرزنش کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے بدنما کردار پر نظر نہیں کی' صرف اس لیے کہ وہ ایک مرد ہے اور اس کے لیے بدترین افعال بھی جائز ہیں۔

B A کے آخری سال کا نتیجہ آیا تو اقبال خوشی سے جھومنے لگا۔ کیونکہ وہ اول نمبروں سے پاس ہوا تھا اور جمال علی فیل ہو گیا تھا۔ اقبال اس خوشی میں ہوسٹل سے اپنا سامان سمیٹ ہی رہا تھا کہ ڈاکیہ خط لے کر آ جاتا ہے۔ اس میں لکھا تھا'' فوراً گھر چلے آؤ تمہارے والد بہت بیمار ہیں'' جب وہ بدحواسی کے عالم میں گاؤں پہنچتا ہے تو والد کی بجائے ان کی قبر دیکھنے کو ملتی ہے تو اس کے صبر وضبط کا باندھ ٹوٹ جاتا ہے اور سارا ماحول اس کے آنسوؤں میں بہنے لگتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے والد مرحوم کے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے پھر شہر واپس آ جاتا ہے۔ لیکن اب زندگی کی حقیقتیں اس کے سامنے آنے لگتی ہیں' اور وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ سفارش اور دینے کے لیے روپیہ بھی ہونا ضروری ہے تب کہیں جا کر نوکری کی دیوی مہربان ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس کی زندگی بھوک کی گرفت میں آنے لگتی ہے۔ اور جب پوری طرح بھوک اس کی زندگی میں پاؤں پسار لیتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ جمال علی کی سفارش سے اسے کوئی نہ کوئی نوکری ضرور مل جائے گی۔

اس خیال کے آتے ہی وہ اپنے اندر توانائی محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے قدم خود بخود اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگتے ہیں جہاں جمال علی کی بہن نجمہ کا دہکتا ہوا جسم اس کی قربت کے انتظار میں کئی مہینوں سے تڑپ رہا تھا۔ وہ یکایک اقبال کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے اور صرف اتنا ہی کہہ پاتی ہے ''ارے تم'' اور اقبال شرمندگی کے احساس تلے بڑی مشکل سے صرف اتنا ہی کہہ پاتا ہے ''میں بے روزگار ہوں'' بھوک کی راہوں سے گزرتے ہوئے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو یہ کہنے کے لیے کتنے عذابوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کا اندازہ فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھ کر نہیں لگایا جا سکتا' کیونکہ انسان بھوک کی گرفت میں آتے ہی برے سے برا کام کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ بقول شاعر ؎

جو نہ کرنے کے ہیں وہ کام بھی کر جاتے ہیں
پھر بھی کتنے ہی بشر بھوک سے مر جاتے ہیں

اس کے بعد نجمہ کے اندر چھپی ہوئی وصل کی پیاسی عورت پوری طرح بیدار ہو جاتی ہے اور اقبال کو کھانا کھا کر جانے کے بہانے روک لیتی ہے۔ کئی روز کی بھوک نے اقبال کے اندر انکار کی جرأت کو ہلاک کر دیا اور وہ اپنی بھوک کو

پوری طرح مطمئن کرنے لگا جبکہ نجمہ اپنے ناپاک ارادے کو انجام دینے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ ادھر اقبال کھانے سے ہاتھ کھینچتا ہے ادھر وہ اس کا بازو پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیتی ہے اور اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کر دیتی ہے اور اقبال کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے تو اس کے خوبصورت نرم و گداز جسم کا لمس پاتے ہی اقبال کے اندر سویا ہوا مرد جاگ جاتا ہے اور دونوں کے بدن خود بخود لباسوں کے بوجھ کو اتار پھینک دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے اس طرح چمٹ جاتے ہیں کہ ہوا کے گزرنے کے امکانات بھی مفقود نظر آتے ہیں اور جسموں کا یہ عمل دونوں کو کئی گھنٹے مصروف رکھتا ہے۔ اس کے بعد کے منظر میں اقبال کپڑے پہن لیتا ہے لیکن نجمہ برہنہ ہی بیڈ پر لیٹی رہتی ہے۔ جب وہ جانے کے ارادے سے قدم اٹھاتا ہے تو وہ بیڈ سے برہنہ ہی اترتی ہے اور اس کے جسم سے جسم کو پوری طرح سٹا کر پچاس روپے یہ کہتے ہوئے اس کی جیب میں ڈال دیتی ہے کہ ''اگر پچاس روپے روز کمانا چاہتے ہو تو میرے پاس آ جانا۔

کہانی کا یہ اقتباس یہ باور کراتا ہے کہ جوان بیوہ عورت کی دوسری شادی میں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ وہ مرد کے قرب سے سیراب ہونے کے بعد اس کی فرقت کا دکھ نہیں جھیل پاتی ہے اور کسی بھی وصل آمادہ نازک لمحے میں بہک جاتی ہے۔

ایک دن اقبال نجمہ کے بدن کی پیاس بجھا کر سیڑھیوں سے اتر ہی رہا تھا کہ جمال علی آ جاتا ہے اور اسے دیکھ کر غصے میں اپنا آپا کھو بیٹھتا ہے۔ یہاں وحشی سعید نے عورت کے مکر کو ایک مشاق افسانہ نگار کی طرح بیان کیا ہے۔ ''میں کیا کرتی بھیا یہ تو چھ ماہ سے آ رہا ہے بھکاری سمجھ کر دس بیس روپے تمہارا صدقہ اسے دے دیتی ہوں۔'' یہ ہے عورت کا مکر جس کی زد سے مرد کا بچ نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ اقبال بھائی اور بہن کی تیز آواز گفتگو کو ادھورا چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ بدحواسی کے عالم میں اسے کائنات کی ہر شئے گھومتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ زمین پر گر پڑتا ہے۔ اتنے میں ایک تیز رفتار گاڑی اس کے نڈھال جسم کو روند کر گزر جاتی ہے۔ تمام رات اس کا مردہ بدن سڑک پر ہی پڑا رہتا ہے۔ صبح ہوتے ہی میونسی پیلٹی کی گاڑی اس کی لاش کو اٹھا کر لے جاتی ہے اس جگہ دفنانے کے لیے جہاں اس کے جیسے بہت سے سستے لہو کے مالک دفن ہیں۔ کہانی کا آخری جملہ اپنے معنوی احساس میں غربت پر ایک کھلا ہوا طنز ہونے کے ساتھ یہ سبق بھی دیتا ہے کہ تعلیم کی للک میں گاؤں سے آنے والے غریب نوجوان کو بدکردار امیروں کی صحبت سے دور رہنا چاہیے۔ ورنہ انجام وہی ہوگا جو وحشی سعید نے اپنی کہانی میں دکھایا ہے۔

چونکہ وحشی سعید کی سوچیں اپنی افسانہ نگاری کے ابتدائی زمانے سے ہی حساس ہیں اگر ایسا نہیں ہوتا تو دورانِ تعلیم ''سستا لہو' ایسی زندگی کے تجربات سے لبریز کہانی نہیں لکھ پاتے۔ کیونکہ طلبہ کی زندگی کتابوں اور قہقہوں کے درمیان فضول مباحث میں اپنے قیمتی وقت کو گنواتی رہتی ہے۔ لیکن وحشی سعید نے اپنے لمحے لمحے کو بہترین کہانیاں اور ناول لکھنے میں صرف کیا جس نے انھیں اس دور کا معتبر افسانہ نگار بنا دیا ہے۔

☆☆☆

مرا قلم ہے مرا مُبلّغ

عامؔر قدوائی، کویت۔

مرا قلم ہے مرا مُبلّغ
تمہارے حربے نہ کام آئیں گے کوئی مجھ پر
بنا سکو گے نہ مجھ کو مہرہ سیاستوں کا
مرا قلم ہے مرا مبلغ
صدائیں سنتا ہے صرف دل کی
یہ دل بھی ایسا
غلام بن کر نہیں جیا ہے کبھی کسی کا
مرے قلم نے جو لکھ دیا ہے وہ معتبر ہے
مگر جو تم نے سمجھ لیا ہے میں وہ نہیں ہوں
میں اک نمائندۂ ادب ہوں
میں اک نمائندۂ زمانہ
مرا قلم ہے گواہ میری شرافتوں کا
مرا قلم ہے گواہ دل کی صداقتوں کا
مرا قلم ہے گواہ سچی وراثتوں کا
جو دیکھتی ہیں یہ میری آنکھیں میں لکھ رہا ہوں
جو دل کو محسوس ہو رہا ہے وہ کہہ رہا ہوں

مرا قلم تو حقیقتوں کا پیامبر ہے
مرے قلم سے قصیدہ گوئی نہ ہو سکے گی
مرا قلم ہے امین تہذیب زندگی کا
کہیں بھی جس میں کثافتوں کا گزر نہیں ہے
مرے قلم سے جو لفظ نکلے وہ آئینہ ہیں
کہ عکس جن میں زمانے بھر کا چمک رہا ہے
مرا قلم ہے اسیر سچ کا
مرا قلم ہے ضمیر میرا
مرا قلم ہے جنوں کی بستی کا شاہزادہ
مرا قلم ہے مرے جنوں کا نقیب عامؔر
مرا قلم ہے حقیقتوں کا نقیب عامؔر
مرا قلم ہے مرا مبلّغ
مرے قلم نے جو لکھ دیا ہے وہ معتبر ہے۔

☆☆☆

سائبان

شبِ رخصت
دھڑکتا دل، لرزتے ہونٹ پتھرائی ہوئی آنکھیں
مرے ماتھے پہ تیرے پیار کا اک قیمتی بوسہ
یہی وہ الوداعی پیار تھا، جس کو چھپا لائی ہوں میں
اشکوں سے نم آنکھوں کے آنچل میں
عجب ورثہ ہے فرحت بخش رشتے کا
جو میرے پاس ہے اب بیش قیمت موتیوں جیسا
وہ کچھ لمحے، رفاقت کے حسیں موسم
مسیحائی کے پھولوں کی شفا دیتی ہوئی خوشبو
جواب میرا اثاثہ ہے
تیری پلکوں کے دھاگوں سے
پروئے مامتا کی جھالروں میں پیار کے آنسو
محبت میں بندھے آواز کے ریشم میں کچھ گوہر
بھرا ہے یہ خزانہ میرے آنچل میں
کبھی گر زخم چھل جائے
مری تنہائی میں جکڑی ہوئی جاں کا
تو مرہم ہے مرا یہ قیمتی ورثہ
یہی میرا اثاثہ
میرے زخموں کا مداوا ہے
خزاں نا آشنا ہے وہ شجر تیری دعاؤں کا
جو مجھ پہ سایہ افگن ہے !

☆☆☆

پروین شیر۔ امریکہ

تناؤ

میں تھک چکی ہوں کہ
رُک گئی ہوں
کہ راہیں مجھ سے خفا ہوئی ہیں
شعور کے راستوں پہ پہرے
دلوں کے میلے اُجڑ چکے ہیں
دماغ ایسے بھٹک رہا ہے
کہ جیسے کوئی ہوا کا جھونکا
الگ ہوا اپنے کارواں سے
حسین خوشبو کا ایک لمحہ
بھٹک گیا گُل کی داستاں سے
سجے ہیں ایوانِ دل میں، تاریکیوں کے منظر
بجھے چراغوں کی قصرِ دل پہ صفیں لگی ہیں
تمام دن کے تھکے ہوئے
کتنے آفتابوں نے شب کی چوکھٹ پہ دم ہے توڑا
مگر نہ شب کی امید ٹوٹی
تھکی نہ سورج کی کرن کوئی بھی
نہ جانے میں کیسے تھک گئی ہوں
نہ میں کیسے رُک گئی ہوں۔

☆☆☆

ملکہ نسیم۔ جے پور

ایک نظم

(محسنِ غالبیات تسلیم احمد تصور کی نذر)

غالب تو تھے دلّی میں
دلّی ہی وطن اُن کا
مرقد بھی وہیں ان کا
لیکن سبھی دنیا میں
غالب کا وطن ٹھہرا
اُردو کا چلن ٹھہرا
غالب کے ہیں شیدائی
امریکہ میں، لندن میں
لاہور کی بستی میں
تسلیم تصور نے
اک بزم سجائی ہے
غالب کو وہ دلّی سے
لاہور میں لائے ہیں
غالب کے وہ چرچے ہیں
لاہور میں حیرت ہے

دنیا کے لکھاری سب
لاہور میں آتے ہیں
غالب کی سبھا میں سب
کچھ پھول چڑھاتے ہیں
کچھ دیپ جلاتے ہیں
لاہور کے لوگوں سے
غالب کو ملاتے ہیں
تسلیم تصور کو
غالب کا ولی کہہ کر
ہر اک کو بتاتے ہیں
تسلیم تصور کا
لاہور کی بستی میں
یہ نیک عمل ٹھہرا
اک جشن غزل ٹھہرا

☆☆☆

احمد رئیس
ناظم آباد کراچی۔

غزل

یہ زمیں میری جسارت سے سوا مانگتی ہے
قیمتِ روشنی و آب وہوا مانگتی ہے
میری امید پہ ہے نزع کا عالم طاری
شام سے رات گزرنے کی دعا مانگتی ہے
ہم نے دنیا سے کوئی عہد کیا ہی کب تھا
مانگنے دو جو وہ انعامِ وفا مانگتی ہے
میری خواہش مجھے شرمندہ نہ کردے لوگو
موسمِ گل میں بھی زخموں کی قبا مانگتی ہے
زندگی چند نَفس اور ترے باقی ہیں
اب اُٹھائے ہوئے کیا دستِ دعا مانگتی ہے
کون اب ایسے چراغوں کو کرے گا روشن
جن چراغوں کو بجھانے کو ہَوا مانگتی ہے
میری تحویل میں آنسو نہ ستارے اختر
ہجر کی رات مگر مجھ سے یہ کیا مانگتی ہے

☆☆☆

اختر شاہ جہاں پوری
08953035474

غزل

جو کچھ پایا ہے اک دن اس کو کھونا ہے بہر صورت
جو ہنستے ہیں کبھی ان کو بھی رونا ہے بہر صورت
سبھی تدبیریں زیبِ طاقِ نسیاں ہو کے رہنی ہیں
مقدر میں جو ہونا ہے وہ ہونا ہے بہر صورت
بھلا بدلے کی خاطر نیکیاں ہم نے کہاں کی ہیں
ہمیں تو ان کو دریا میں ڈبونا ہے بہر صورت
جنھیں توفیق کچھ حاصل نہیں ہنسنے ہنسانے کی
انھیں آٹھوں پہر بس رونا دھونا ہے بہر صورت
مگر ان کے اُگانے پر ہمیں قدرت نہیں حاصل
ہمیں تو نیکیوں کا بیج بونا ہے بہر صورت
حیات اک زہر کا پیالہ سہی، پینا ضروری ہے
جو اک بارِ گراں ہے اس کو ڈھونا ہے بہر صورت
جو پیتل ہے وہ پیتل ہی رہے گا لاکھ چمکاؤ
دَبا ہو خاک میں سونا تو سونا ہے بہر صورت
رہِ شعروادب کا گر میں رہبر ہو نہیں سکتا
مجھے اک معتبر راہی تو ہونا ہے بہر صورت

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب راہی
09421751064

دوغزلیں

نقشبند قمر نقوی بخاری

جسم کو چھوڑا تو بن روح پائندہ رہا
موت کیسی میں تو اس کے بعد بھی زندہ رہا

لاکھ تدبیروں نے بھی بدلی نہ وضعِ زندگی
آدمی اپنے مقدر سے ہی شرمندہ رہا

چند لمحوں کا تغیر، کیا غروب اور کیا طلوع
رات ہو یا دن ہو، سورج تو درخشندہ رہا

میں نہیں وہ نجمِ ثاقب جَل کے ہوجائے جو راکھ
میں ستارہ ہوں جو اک مرکز پہ تابندہ رہا

انجمن میں شوق کی ساری ہی شمعیں بجھ گئیں
اک چراغِ آرزو تھا جو فروزندہ رہا

سارے امکانات کرتے ہی رہے میرا حصار
منتخب جس کو کیا میں نے وہی زندہ رہا

میری مرضی کے مطابق اس میں تبدیلی رہی
یہ زمانہ تو ہمیشہ میرا کارندہ رہا

☆☆☆

بہت دن سے مجھے کوئی غزل اچھی نہیں لگتی
اگر بحر رجز میں ہو رمل اچھی نہیں لگتی

تمنا کا لقب حسرت نہ جانے کس نے رکّھا ہے
مجھے یہ بے تُکی ردّ و بدل اچھی نہیں لگتی

یہ کیسی ذہنیت روز اک نئے جلوے کی طالب ہے
کہ جو شے آج اچھی ہے وہ کل اچھی نہیں لگتی

وہ سارے زندگی سے اپنی جو مایوس و نالہ ہیں
تعجب یہ ہے اُن کو بھی اَجَل اچھی نہیں لگتی

کبھی ایسا بھی دن آئے خبر امن و اماں کی ہو
کہ اب دن رات کی جنگ و جدل اچھی نہیں لگتی

کوئی اک وضع پر قائم رہے دشوار ہے لیکن
نکل جاتے ہیں جس رسّی سے بَل اچھی نہیں لگتی

نہ جانے کس نے میرے ساتھ شب بھر کروٹیں بدلیں
مجھے بستر کی چادر پر یہ شل اچھی نہیں لگتی

دوغزلیں

عزیزؔ اعظمی، مبارک پوری 07385088012

سحر آئی مگر شاداب نظّاروں کو لے ڈوبی
کرن سورج کے شبنم کے جگر پاروں کو لے ڈوبی

نہ قاتل کو نہ قاتل کے طرفداروں کو لے ڈوبی
ادا منصف کی مقتولوں کے غمخواروں کو لے ڈوبی

تبسم آشنا ہونٹوں پہ انگارے دہکتے ہیں
کسی کی برق سامانی چمن زاروں کو لے ڈوبی

غموں آلام کے بھڑکا کے شعلے چند چھینٹوں سے
گھٹا ساون کی اپنے آس کے ماروں کو لے ڈوبی

زمانے کے لیے ہم نے تو اپنی جان تک دیدی
مگر دنیا محبت کے گنہ گاروں کے لے ڈوبی

بھرم کُھل ہی گیا آخر تری اس پردہ داری کا
ستم پَروَر حیا کتنے حیا داروں کو لے ڈوبی

بہت مشکل ہے بچنا اے عزیزؔ اُس کی اداؤں سے
کہ جس کی اک ادا سارے اداکاروں کو لے ڈوبی

☆☆☆

مشتعل ہو کے بھڑکتے ہوئے مشعل کی طرح
آج بھی ظلم ہے ظالم کا وہی کل کی طرح

نذرِ آتش ہے چمن گزرے ہوئے پَل کی طرح
ہر روش اب بھی شفق رنگ ہے مقتل کی طرح

ڈالتے رہئے دہکتے ہوئے انگاروں میں
سونا ہوگا نہ کسی حال میں پیتل کی طرح

قتل کے بعد بھی جائے گی نہ بُوئے عظمت
میری فطرت نہ بدل پاؤ گے صندل کی طرح

مہرباں دھوپ ہے بھیگے ہوئے دامن پہ مگر
سوکھتا ہی نہیں بیواؤں کے آنچل کی طرح

زہر سے زہر کی فطرت کا گِلہ کیا کیجے
اس کے ساغر میں ہے امرت بھی ہلاہل کی طرح

عالمِ صبح میں رخسار کی رعنائی ہے
منظرِ شام ہے گیسوئے مسلسل کی طرح

ابرِ باراں کا گماں کیوں ہے تجھے اِس پہ عزیزؔ
کوئی گِریاں ہے برستے ہوئے بادل کی طرح

غزل

لہو کی چوں کہ ارزانی بہت ہے
لہٰذا شے یہ بے معنی بہت ہے
ہمیشہ شورشِ پیہم کی عادی
ریاست دل کی بلقانی بہت ہے
بلا کھٹکے ہی آئیں آنے والے
علاقہ دل کا میدانی بہت ہے
ادائیں، ناز، نخرے، آزمائش
محبت میں پریشانی بہت ہے
مجھے وہ چاہتا دل سے ہے لیکن
بس اُس ظالم میں نادانی بہت ہے
محبت یوں تولازم ہے پہ اس میں
سکونِ دل کی قربانی بہت ہے
ہزاروں زخم کھاکر بھی ہوں زندہ
اُسے اس پر بھی حیرانی بہت ہے
زمانے میں محبت عام کرنے
ہمیں اک دن کی سلطانی بہت ہے

☆☆☆

خان حسنین عاقب
09423541874

غزل

ایک تصویر جلانی ہے ابھی
ہاں مگر آنکھ میں پانی ہے ابھی
اس نے جب ہاتھ ملایا تو لگا
دل میں اک پھانس پرانی ہے ابھی
ابھی باقی ہے بچھڑنا اس سے
نامکمل یہ کہانی ہے ابھی
اے ہوا ایسی بھی کیا عجلت
کیا کہیں آگ لگانی ہے ابھی
راستہ روک رہی ہے اک یاد
یہ بھی دیوار گرانی ہے ابھی
ذہن ہر بات پہ آمادہ ہے
دل نے اک بات نہ مانی ہے ابھی
یہ جو پتھر ہیں انھیں ٹوٹنا ہے
میرے اشکوں میں روانی ہے ابھی
آسماں پوچھ رہا ہے طارقؔ
گرد کچھ اور اُڑانی ہے ابھی

☆☆☆

طارق قمر، لکھنؤ۔09335915058

دو غزلیں

شارق عدیل

☆☆

رنگ محل، ویران کھنڈر ہجر و وصل کے رستے میں
حائل ہیں کتنے منظر ہجر و وصل کے رستے میں
پیار کی خوشبو بن کے تھکن سارے بدن میں پھیل گئی
کیسے کروں طے راہِ سفر ہجر و وصل کے رستے میں
رنج و مسرت کے آکر سارے پرندے لوٹ گئے
سوکھ گیا ہر ''خوابِ شجر'' ہجر و وصل کے رستے میں
جسم ادھوری خواہش کا دوش پہ ہے اک بار گراں
کیا کیجے اب شام و سحر ہجر و وصل کے رستے میں
ایک اکیلا دل ڈھوتا بوجھ کہاں تک سانسوں کے
ختم ہوا اب میر سفر ہجر و وصل کے رستے میں
مایوسی میں خوش فہمی گھول رہی تھی رس اپنا
ہوش میں کب تھے ذہن و نظر ہجر و وصل کے رستے میں
سبز رُتوں کے دامن میں ریت کے دریا بہتے ہیں
کیا کھولیں خوابوں کے در ہجر و وصل کے رستے میں
ہر جذبے کے پس پردہ جاگ رہی ہے مایوسی
ٹھہرا ہوں کس منزل پر ہجر و وصل کے رستے میں

☆☆

خموش ہوگیا کیوں کر تو کچھ تو بول قلندر
حیات کہتے ہیں کس کو یہ راز کھول قلندر
غمِ حیات سے چھپ کر پڑا ہے دشت میں تنہا
ہے تیری ذات میں شاید بلا کا جھول قلندر
اُگلتے رہتے ہیں چیخیں ہمارے شہر کے رستے
اگر ہے حوصلہ تجھ میں تو ان پہ ڈول قلندر
ملی ہے لمس کی لذّت تو کیا سرور میں آنا
خنک ہوا کے بدن کو نظر سے تول قلندر
یہ بھیڑ سانسوں میں اپنی اتار لے شاید
تو اپنے لہجے کی تلخی فضا میں گھول قلندر
چراغ ہونے لگیں گے ترے ضمیر میں روشن
میں ایک راز ابتک مجھے ٹٹول قلندر

☆☆

غزل

تبسم رحمانی۔ موبائل نمبر 09783840906

اُڑان اُن کے تخیل کی کمال ان کی نظر کا ہے
جو پل میں بھانپ لیتے ہیں ہوا کا رُخ کدھر کا ہے

مسافر کو سفر کی دھوپ میں سائے سے مطلب ہے
غرض اُس کو نہیں اس سے کہ سایہ کس شجر کا ہے

پکڑ کر صبح کی اُنگلی اُجالا پھر سے لوٹے گا
اندھیرے سے نہ گھبراؤ اندھیرا کچھ پہر کا ہے

فقط عنوان کو پڑھ کر میں اکثر جان لیتا ہوں
کہانی کس کے گھر کی ہے فسانہ کس کے گھر کا ہے

مآلِ عشق پرائے رونے والو یاد یہ رکھنا
یہ رونا ایک دو دن کا نہیں ہے عمر بھر کا ہے

کوئی بہتر سے بہتر رہ گزر اچھی نہیں لگتی
تصور جب سے آنکھوں میں تمہاری رہ گزر کا ہے

محبت کرنے والو وقت ہے اب بھی سنبھل جاؤ
زمانہ یہ محبت کا نہیں ہے مال و زر کا ہے

کوئی گرد ڈھونڈنا چاہے اُسے جا کر کہاں ڈھونڈے
زمانے میں کہاں کس کو پتہ اُس بے خبر کا ہے

مسافر کے سرِ منزل تبسم حوصلے دیکھو
بدن ہے چور زخموں سے ارادہ پھر سفر کا ہے

غزل

مدہوش بلگرامی۔ 08726189282

اس نے جو مجھ کو اپنا صاحب سمجھ لیا
دنیا نے ظلم کرنا مناسب سمجھ لیا

اس کی غزل سرائی پہ ہم چُپ تھے اس لئے
اس نے ہی اپنے آپ کو غالب سمجھ لیا

لرزے نہ میرے لب نہ ہوئی جنبشِ نظر
پھر بھی تو اس نے خود سے مخاطب سمجھ لیا

دیتا نہیں جواب وہ میرے سوال کا
سچ بولنا جو میں نے مناسب سمجھ لیا

محنت کی ہی کمائی کھلاتا رہا جنھیں
لوگو! مجھے انھوں نے ہی غاصب سمجھ لیا

مصلوب اس کو اس لئے دنیا نے کردیا
تقدیر کا بتوں کو جو کاتب سمجھ لیا

مدہوش غیر ہو کہ کوئی ناشناس ہو
ہنس کر ملا اُسی کو مصاحب سمجھ لیا

☆☆☆

غزل

مظفر احمد مظفر مقیم لندن، برطانیہ۔

کوئی محروم محبت نہ رہا میرے بعد
رنگ لائی مری تاثیرِ دعا میرے بعد

آج عیسی کی طرح دار پہ کھینچے ہے مجھے
مجھ کو روئے گی یہ مخلوقِ خدا میرے بعد

ایسی روٹھی ہے چمن سے تری ربّ کریم
پھر چمن میں نہ گئی بادِ صبا میرے بعد

فاتحہ کے لئے آیا تھا وہ ہمراہِ رقیب
خوب دی اس نے محبت کی سزا میرے بعد

صبح دم آئی ہے اس سوختہ سامانی میں
باغ سے نالۂ بلبل کی صدا میرے بعد

میری جانب سے کوئی جاکے کہے مجنوں سے
خاکِ صحرائے تمنا نہ اُڑا میرے بعد

اس نے احباب سے پوچھا ہے مرے گھر کا پتہ
یاد آیا اسے پیمانِ وفا میرے بعد

رنج تو یہ ہے مظفر کہ وہ پیمانِ شکن
لب پہ لایا نہ کبھی حرفِ دعا میرے بعد

☆☆☆

غزل

محمد شاہد پٹھان۔ 09392843907

دل میں چاہت نہ رکھی کوئی نہ جذبہ رکّھا
سر میں سودا جو رکھا ہم نے غزل کا رکّھا

پاس آدابِ محبت کا نہ تھوڑا رکّھا
تو نے یوسف پہ جو الزام زلیخا رکّھا

غم تو ہر شخص کی قسمت میں لکھا ہے لیکن
میرے حصّے میں مشیّت نے زیادہ رکّھا

جس کو بھی چاہا اسی کو نہ خبر ہونے دی
ہم نے اظہارِ تمنا میں بھی پردہ رکّھا

جس کا ملنا تھا کٹھن، جس کی ہوس تھی بے سود
دل نے اس کی ہی طلب، اس کا ارادہ رکّھا

ہم بھی مجبور محبت رہے تاحینِ حیات
عشق نے اُس کو بھی مجبورِ تمنا رکّھا

عقل کے پھیر میں الجھے رہے دنیا والے
عشق والوں نے فقط دل پہ بھروسہ رکّھا

اپنے معیار پہ اتری نہیں دنیا شاہد
ہم نے مجبوری میں ہر شخص سے رشتہ رکّھا

☆☆☆

دو غزلیں

شمشاد جلیل شاؔد۔ پونے

بیچ اپنوں کے اب دوریاں دیکھ کر
بڑھ رہی ہے خلش تلخیاں دیکھ کر

گھونسلوں سے پرندے بھی اُڑنے لگے
باغ میں ہرطرف آندھیاں دیکھ کر

دل مرا مورسا رقص کرنے لگا
لہلہاتی ہوئیں کھیتیاں دیکھ کر

اس کی بے چینیاں حد سے بڑھنے لگیں
ٹوٹے دل کی مرے کرچیاں دیکھ کر

بس ذرادیر کو وہ رُکا تھا یہاں
پیار کی ہر طرف بدلیاں دیکھ کر

رنگ مہندی کا اس کو دغا دے گیا
خوب روتی رہی ڈولیاں دیکھ کر

چاند الجھن میں تھا شاؔد کل رات میں
چاندنی کی عجب شوخیاں دیکھ کر

☆☆☆

چاندنی ،چاندنی بن کے آئی غزل
دل میں آکر مرے جگمگائی غزل

نام آیا ہی تھا ان کا ہونٹوں پہ بس
دل ہی دل میں بہت گدگدائی غزل

نفرتیں جب بھی دیکھیں مرے شعر میں
پیار کی تونے دی ہے دُہائی غزل

کچھ سفر طے کیا مشکلوں کا مگر
آج ہر دل پہ بس تو ہی چھائی غزل

ہر طرف تذکرہ ہے ترے نام کا
سب کی کرتی ہے تو رہنمائی غزل

بن گیا دل کتابِ محبت مرا
تجھ سے جس پل ہوئی آشنائی غزل

لکھ رہی ہے ورق شاؔد تہذیب کے
ہے قلم میں تری روشنائی غزل

☆☆☆

برہان پور، ایم پی کے چار شاعر

غزل

تعصب وقت کے سینے میں جب کروٹ بدلتا ہے
زمینِ امن پر انسانیت کا دل دہلتا ہے

ہمارے صبر کو تم بزدلی کا نام مت دینا
یہ وہ سورج ہے جس سے ظلم کا لشکر پگھلتا ہے

زمیں روشن ہے ہم سے ہم زمیں کے ماہِ نخشب ہیں
فلک پر بھی ہمارے نام کا تارہ نکلتا ہے

یزید و شمر زندہ ہیں یہ پوشاکیں انھیں کی ہیں
"پرانی آستینوں سے لہو تازہ نکلتا ہے"

ہماری پیاس ٹکراتی ہے جب ریتوں کے تودوں سے
زمینِ سنگ پہ اک چشمۂ زم زم اُبلتا ہے

ہراک شے اپنے ذاتی وصف سے بکتی ہے منڈی میں
گل وعنبر کا کاروبار بھی خوشبو سے چلتا ہے

کبھی من چاہی نعمت پاکے بھی ہم خوش نہیں ہوتے
کبھی جھوٹی تسلّی سے بھی اپنا دل بہلتا ہے

☆☆☆

عاؔبد قزلباش۔ 09826475179

غزل

بن کے خوشبو بکھر گیا ہوں میں
روح و دل میں اُتر گیا ہوں میں

میرے دشمن کو دے خبر کوئی
غرق ہوکر اُبھر گیا ہوں میں

نام زندہ رہے گا صدیوں تک
کام ایسے بھی کر گیا ہوں میں

عمر میں نے گزاری غیروں میں
بعد مدت کے گھر گیا ہوں میں

یاد بن کر دلوں میں زندہ ہوں
لوگ کہتے ہیں مرگیا ہوں میں

مجھ کو چونکا دیا خیالوں نے
اپنے سائے سے ڈر گیا ہوں میں

جن کے ہاتھوں اسد سنورتا ہے
اُن کے ہاتھوں بکھر گیا ہوں میں

☆☆☆

اسؔد برہانپوری۔ 09926343891

غزل

جیسے خورشید سے تاروں میں چمک آتی ہے
میری بیٹی میں مری ماں کی جھلک آتی ہے

کیا پتہ کون سی بستی کا وہ باشندہ ہے
اُس کے کردار سے پھولوں کی مہک آتی ہے

کارِ بد سے تو سیہ ہوتے ہیں دل کے شیشے
نیک اعمال سے چہرے پہ چمک آتی ہے

روز دل سے میں اسے دور کیا کرتا ہوں
روز یہ دنیا مری سمت سرک آتی ہے

کتنی ماؤں سے بچھڑ جاتے ہیں اُن کے بچے
جب کسی گاؤں سے ملنے کو سڑک آتی ہے

چاندنی ہو کہ گھٹا ہو کہ ہو پھولوں کی بہار
میرے زخموں کے لئے لے کے نمک آتی ہے

☆☆☆

شعور آشنا۔ برہان پور ایم پی
09893926022

غزل

کیا کریں عمر چراغوں کی بڑھانے کے لئے
طالبِ نور ہواؤں کو بنانے کے لئے

میں وہ فنکار ہوں جس نے بڑی محنت کی ہے
اپنے احساس کو آئینہ بنانے کے لئے

آئینہ خانوں میں گم ہوگئے چہرے ان کے
گھر سے نکلے تھے جو پہچان بنانے کے لئے

وقت آنکھوں سے بھی محروم نہ کردے ہم کو
اپنے چہرے کی حقیقت کو چھپانے کے لئے

جن کی سچائیاں محرومِ سند ہیں اے تاؔج
وہ تُلے ہیں مجھے سقراط بنانے کے لئے

☆☆☆

تاؔج محمد تاؔج۔ بدھوارہ، برہان پور
09685032215

راجستھان کا ایک معتبر شاعر: ڈاکٹر محمد حسن

شاہد احمد (ریسرچ اسکالر۔ شعبۂ اردو فارسی۔ راجستھان یونیورسٹی۔ جے پور)

ڈاکٹر محمد حسین کا نام آج ہندوستان کے اردو ادب میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ راجستھان کے موجودہ مقتدر محققین میں سے ہیں۔ ایک عرصہ سے ڈونگر کالج، بیکانیر کے شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ آپ کی نگرانی میں اب تک کئی طالب علم تحقیقی مقالات مکمل کر چکے ہیں۔ آپ کی کئی تحقیقی کتب شائع ہوکر قبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ راجستھان کے ریسرچ اسکالرز کے لیے مشعل راہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کتب میں اردو تحقیق کا ارتقاء۔ امعان وابتغا، بیدل بیکانیری، تعارف وتبصرہ، ابوالکلام آزاد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے کئی کتب کا ترجمہ کیا اور نثر ونظم کی کتب مرتب کی ہیں۔ حال ہی میں آپ نے ایک بہت اہم کام انجام دیا ہے۔ ایسا کام جو راجستھان میں اب تک نہیں ہوا تھا۔ ''دفتر الشعرا'' جو مولوی سلیم الدین تسنیم کی قلمی تصنیف ہے، اس کی تدوین کم وبیش پوری کر چکے ہیں اور یہ گرانقدر تصنیف اشاعت پذیر ہوکر منظر عام پر آ چکی ہے۔ علم عروض پر یہ ایک مستند کتاب ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے یو سی جی کے اہم پروجیکٹ بھی مکمل کئے ہیں۔ آپ کے بے شمار تحقیقی و تنقیدی مضامین ملک کے مقتدر رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ بنیادی طور پر آپ ایک محقق اور نقاد ہیں۔ علم عروض سے آپ کو مکمل واقفیت ہے۔

عام طور پر ایک محقق اور ناقد میں جمالیاتی حسن کا فقدان دیکھا جاتا ہے۔ اس کے مزاج میں خشکی عود کر آتی ہے۔ شاعری تو دور کی چیز ہے اس کو قدرتی مناظر بھی نہیں بھاتے۔ لیکن ڈاکٹر محمد حسین صاحب کے یہاں حالت اس کے برعکس ہے۔ وہ قدرتی مناظر سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور حقیقت نگاری کی ترجمانی بھی کرتے ہیں موصوف محقق اور ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ نہ صرف طالب علموں کو اردو ادب کی جمالیات سے واقف کراتے ہیں بلکہ خود بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ ابھی حال ہی میں موصوف کا ایک مجموعہ کلام طبع ہوکر منظر عام پر آیا ہے۔ جس کا عنوان ''صنم خانۂ خواب'' ہے۔ ایک سو ساٹھ صفحات کے اس مجموعے میں ۶۷ غزلیں شامل ہیں۔ سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔ چھپائی عمدہ کاغذ پر کی گئی ہے۔ اس مجموعے کو سوشل پروگیسیو سوسائٹی، بیکانیر نے ۲۰۱۶ء میں شائع کیا تھا قیمت ۳۵۰ روپئے ہے۔

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ شاعر کا کلام اس کے نظریات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ وہ گونا گوں کیفیات سے گزرتا ہے اس لیے شاعری اس کے احساسات اور جذبات کا آئینہ بن جاتی ہے۔ سادگی اور سلاست کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مضطرب ہر آدمی ہے آج کل — اف یہ کیسی زندگی ہے آج کل
عاشقی بھی دل لگی ہے آج کل — اٹھ گئی رسم وفا دنیا سے یوں

حالات حاضرہ اور سلگتے ہوئے مسائل پر بھی موصوف کی گہری نظر ہے۔ فرماتے ہیں۔

معتبر ہو گیا زمانے میں — وہ جو آگے تھا گھر جلانے میں
چھوڑ کر آ گئے وطن پنچھی — ہے کشش کیسی آب و دانے میں

یا مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے۔

دیکھ سب کچھ ہی لٹ گیا میرا — کتنا خطرہ ہے سر اٹھانے میں
باغباں کی نوازشوں ہی سے — آگ روشن ہے آشیانے میں

شاعر ہو اور اس کے دل میں درد نہ ہو ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

جب لگا حال دل سنانے میں
اشک اکثر لگا بہانے میں
اب وہ کہاں بلندیاں اب وہ کہاں ہیں حوصلے
طائر چرخ سیر بھی بے پر و بال ہو گیا

کچھ اور رنگ ملاحظہ کریں۔

اس عدل بے نظیر کی دیجے ذرا تو داد
مصلوب ہم تو اپنے ہی قتلِ عمد کے تھے
میں بے نیاز حسن کے جلووں سے ہو گیا
منظر مری نظر میں جمال صمد کے تھے
صلیب و دار کی زینت ہمیں بنے ہر بار
ہمیں نے پائیں شہادت کی لذتیں ساری
بد دعا لب پر اگر ظلم کا مارا لکھ دے
زلزلے ساری زمیں پر مرے مولیٰ لکھ دے

راجستھان میں موجودہ دور میں جدید شاعری کا بول بالا ہے۔ وہاں ڈاکٹر صاحب نے جدید اور روایتی شاعری، دونوں کو اپنا رکھا ہے۔ جدید شاعری وقت کی اہم ضرورت ہے اور قدیم شاعری اردو ادب کا سرمایا ہے۔ زیر نظر مجموعہ کلام 'صنم خانہ خواب' کے مطالعہ کے بعد نہیں کہا جا سکتا ہے کہ موصوف کی شاعری میں کسی طرح کا نقص ہے۔ فنی اعتبار سے آپ کی شاعری مکمل ہے۔ آپ کا کلام آپ کو اس مقام پر لے آیا ہے جس کا خواب ہر شاعر یا فنکار دیکھتا ہے۔ میں ڈاکٹر محمد حسین صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

مذکورہ اشعار کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں ڈاکٹر محمد حسین راجستھان کے ایک معتبر شاعر ہیں اور میں سمجھتا ہوں کے بہت جلد وہ راجستھان کی حدود سے نکل کر بین الاقوامی شہرت حاصل کریں گے۔

☆☆☆

راجستھان کے مایہ ناز شاعر مولانا قمر واحدی
کی
مثنوی جہیز کی لعنت کا تنقیدی جائزہ

(آمنہ خاتون۔ ریسرچ اسکالر۔ شعبۂ اردو گورنمنٹ پی جی کالج۔ کوٹہ)

سرزمین راجستھان نے مادرِ ہند کی حفاظت، آبرو اور حصول آزادی کے لیے جہاں بہادروں اور کئی جاں باز سپاہیوں کو پیدا کیا وہیں علم وادب کے درخشاں ستاروں کو بھی پیدا کیا ہے۔ جنہوں نے اپنی زندگی قصر ادب کی رونق بڑھانے اور اس کی خدمات کرنے میں صرف کی۔ ان میں ایک بلند پایا شخصیت کا نام ہے مولانا محمد ایوب خاں قمر واحدی جو جے پور کے مشہور و معروف استاذ تھے۔ انھیں راجستھان اردو اکادمی جے پور کا پہلا چیرمین بننے کا شرف بھی حاصل ہے۔

مولانا قمر واحدی یکم دسمبر ۱۸۸۷ء کو جے پور میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی ساتھ ہی قرآن شریف بھی حفظ کیا۔ ۱۹۱۷ء سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ شاعری کا آغاز باقاعدہ طور پر ۱۹۲۵ء سے ہوا تھا۔ قمر صاحب نے غزل، نظم، قصیدہ، نعت، قطعہ، مثنوی تمام اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ انوارِ تجلیات مجموعہ نعت شریف، سردارِ اردو، سفر نامہ مقامات مقدسہ، تاریخ جنگ آزادی اور جہیز کی لعنت وغیرہ کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔

مثنوی "جہیز کی لعنت" مولانا کی مشہور اور نہایت مختصر مثنوی ہے۔ جو ۱۸۰ اشعار پر مشتمل ہے اس مثنوی میں مولانا نے ایک ایسی لڑکی کا ذکر کیا ہے جسے اس کا شوہر جہیز کی لالچ میں اسے مار دیتا ہے اور گھر والے اس کی موت کا الزام مولوی صاحب پر لگا دیتے ہیں جو اس لڑکی کا علاج کرنے کے لیے آتے تھے۔ اور اس منصوبے کے تحت مولوی صاحب کو گھر پر ہی روک لیا جاتا ہے تاکہ اس لڑکی کی موت کا الزام مولوی صاحب پر آ جائے۔

مثنوی کی شروعات حسب معمول حمدیہ اشعار سے ہوتی ہوئی رفتہ رفتہ اپنے مرکزی موضوع تک پہنچ جاتی ہے۔

لے کے میں پہلے اس خدا کا نام — رشیوں منیوں کو کر کے پھر پرنام
یہ کہانی شروع کرتا ہوں — رات دن جس کے غم میں مرتا ہوں
نام اس کا جہیز کی لعنت — میں نے رکھا ہے دیکھ کر حالت

قصہ کی شروعات اس طرح ہوتی ہے کہ مولانا کے ایک جانکار پنڈت اپنی بہو کے آسیب کا علاج کرانے کے لیے مولانا کو اپنے گھر لے جانے کی غرض سے آتے ہیں۔ پھر ان کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔

ایک میرے ہیں جاننے والے
میری سیوا کو ماننے والے
قومیت سے وہ ایک پنڈت ہیں
دھوکہ دینے میں لیکن آفت ہیں
دیکھنے میں وہ بھولے بھالے ہیں
دل کے لیکن بہت ہی کالے ہیں
ایک دن آئے تھے وہ میرے پاس
شکل صورت بنا رکھی تھی اداس

پنڈت جی نے مولانا کو گھر لے جانے کے بعد رات گھر پر ہی روکا اور اسی رات انھوں نے اپنی بہو کا قتل کر دیا خود شوہر نے لڑکی کا گلا دبا کے مار دیا۔ اور یہ کام انھوں نے ایک منصوبے کے تحت کیا۔ ملاحظہ فرمائیں۔۔

یعنی اس رات ہی کو شوہر نے
ظالم اور بد نصیب پتھر نے
وہ جو چنگیز اور ہلاکو تھا
تھا تو شوہر مگر وہ ڈاکو تھا
کچھ کھلا کر اسے کیا بے ہوش
پھر اسے مار کر ہوا رو پوش
اور گلا اس کا اس طرح گھونٹا
جیسے ہتھیار ہو کوئی بھونکا

لڑکی کا قتل کرنے کے بعد اہل خانہ اس جرم سے بچنے کی راہ نکالتے ہیں۔ اور مولوی صاحب پر اس کا الزام رکھتے ہیں ۔مولانا پنڈت کے گھر پہنچتے ہیں اور مریض کو دیکھتے ہیں اس کام سے فارغ ہو کر مولانا گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں پنڈت سے سواری لانے کو کہتے ہیں ۔ پنڈت گھر سے نکلتا ہے اور شام کو بنا سواری کے واپس لوٹتا ہے ۔ ملاحظہ فرمائیں۔

چل دیے تھے وہ ٹھیک تین بجے　　　اور واپس وہ شام کو لوٹے
دیے بتی کے بعد واپس آئے　　　اور کہا ہو سکا نہ کوئی اپائے
اب تو مجبوری کا ہے یہ مقام　　　کشٹ کر کے یہیں کرو آرام

لڑکی کو قتل کرنے کے لئے اس سازش کے علاوہ اور دوسری کوئی بہتر تدبیر ان کے سامنے نہیں تھی۔ یہ منصوبہ اتنا گہرا تھا کہ کام بھی ہو جائے اور وہ بدنام بھی نہیں ہوئے ۔ بہو کو مار کر ڈاکٹر کو گھر پر رات مقیم رکھ کر ڈھونگ رچایا کہ ڈاکٹر اور بیماری کے علاوہ مریض کی موت کا الزام کسی اور پر نہ آسکے۔ رات گزرنے کے بعد جب صبح مولانا کی پنڈت سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ روتا ہوا مولانا سے دریافت کرتا ہے

منہ بنا کر کہا کہ وہ بچی　　　کہ جو تھی رات تک ہمیشہ اچھی
رات کو جانے کیا ہوا اُس کو　　　کہ اچانک وہ مَر گئی شب کو
یہ خبر سن کے میں رہا حیران　　　اور جاتے رہے مرے ارمان
اور آیا سمجھ میں میری اب　　　میرے ٹھہرانے کا تھا یہ مطلب

صبح ہوتے ہی مولانا کے خلاف پولس میں رپٹ درج کرائی جاتی ہے اور پولس مولانا کو تھانے لے جاتی ہے۔ جیل خانہ میں مولانا نے پوری داستان پولس والوں کے سامنے پیش کی، جب حقیقت سامنے آئی تو بے قصوری اور بے گناہی پر پولس نے مولانا کو رہا کر دیا۔ مولانا اپنے ایک دوست محمد عمر ایس پی کی مدد سے آئی جی کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ انصاف کرتے ہوئے اس کیس کے خاتمے کی تدبیر کرتے ہیں ۔آئی جی انصاف پرست انسان تھے اور تفتیش کر کے انھیں رہا کر دیا جاتا ہے۔ بقول خود مولانا فرماتے ہیں

اس مصیبت سے تب نجات ملی　　　سانس مَیں تب اطمینان کی لی
میں ہوں اُن کا بہت ہی شکر گزار　　　اور دعا دیتا ہوں ہزار ہزار

آخر میں مولانا نے اس جہیز کی لعنت کی ہماری جو بے قصور لڑکیوں کی زندگی ختم کر دیتی ہے، اُن کے گھروں کو برباد کر دیتی ہے، اس بیماری کو ہمارے سماج سے ختم کرنا چاہئے۔ بقول مولانا

سب کو مِل کر یہ غور کرنا ہے　　　لازمی طور پر یہ کرنا ہے
تا کہ مٹ جائے اور ہو غارت　　　دیش سے یہ جہیز کی لعنت

اس مثنوی میں کردار نگاری کے لحاظ سے کل چار کردار ابھرتے ہیں۔ پنڈت ،قاتل شوہر، مقتول بیوی اور مولوی صاحب ۔ دونوں باپ بیٹے کے کردار میں انسانیت کے نام پر عیاری ، مکاری اور فریب کاری جیسی برائیوں کے عناصر غالب نظر آتے ہیں وہیں مقتول بیوی کا کردار ہندوستان کی تمام مجبور اور بے بس ظلم سہنے والی عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو جہیز کی لالچ میں ماردی جاتی ہیں۔ مولانا کا کردار ہمدرد اور شریف انسان کا کردار ہے جو خدمتِ انسانیت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے لیکن مولانا کو اس کا صلہ ذلت اور بدنامی کی شکل میں ملتا ہے۔

زبان اور بیان کے لحاظ سے مثنوی جہیز کی لعنت سادگی اور سلاست سے بھرپور ہے۔ موضوع کی روانی اور بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے مولانا نے ہندی الفاظ کے ساتھ کہاوتوں اور محاوروں کا بھی بخوبی استعمال کیا ہے۔ ساتھ ہی انگریزی الفاظ بائکاٹ، اریسٹ، مجسٹریٹ، رپٹ، ڈاکٹر وغیرہ کا بھی استعمال کر کے مثنوی کی دلکشی کو اور بڑھا دیا ہے قاری کو پڑھتے وقت کہیں بھی بوجھل نہیں لگتا۔

یہ مثنوی ہمارے آج کے معاشرے کی برائی کو بھی اجاگر کرتی نظر آتی ہے آج بھی ہندوستان میں جہیز کی صورت میں یہ برائی موجود ہے جسے مولانا نے معاشرے کی سب سے بڑی برائی بتا کر اسے جڑ سے ختم کرنے اور بہو کو بیٹی کی طرح سمجھنے اور لالچ نہ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ تنقیدی لحاظ سے یہ مثنوی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کا تنقیدی جائزہ

وزارت خان۔ ریسرچ اسکالر شعبہ اردو و فارسی راجستھان یونیورسٹی، جے پور۔

ہمارے ادب میں اردو ناول کی عمر زیادہ طویل نہیں ہے۔ یہ جدید ادب کی دین ہے۔ ۱۸۵۷ کے غدر کے بعد ہندوستان کی سیاسی سماجی اور تہذیبی اساس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ حیات کی بساط پلٹ چکی تھی۔ انسان خود اپنے ہی ملک میں غلامی کا طوق لٹکائے پھر رہا تھا۔ مشرقی تہذیب دم توڑنے کے قریب تھی۔ اور جدید تہذیب اپنے ارتقائی سفر کی طرف گامزن تھی۔ ان بدلتے ہوئے اثرات کو ہمارے ادب نے بھی خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ اور اس طرح ہمارے ادب کو ناول کی صورت میں ایک گراں مایہ تحفہ مل گیا۔ ناول ہمارے ادب میں وہ صنف سخن ہے جس کو انسانی زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نسیم نکہت کے قول کے مطابق ''اصناف نثر میں ناول ایک ایسی صنف ہے جو مکمل طور پر ہماری زندگی اور سماج کے نشیب و فراز اور تبدیلیوں کی تصویر پیش کرتی ہے۔''[۱]

اردو ناول نگاری کی تاریخ میں عصمت چغتائی کا شمار نہ صرف ایک بلند پایہ ناول نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے بلکہ ایک نڈر، بے باک اور حقیقت سے منہ نہ موڑنے والی خاتون کی حیثیت سے بھی ان کا نام ادبی حلقوں میں متعارف ہے۔ حالاں کہ ان کی شخصیت کئی جہتوں سے تنازعات کے بوجھ تلے دبی رہی۔ لیکن انہوں نے ان تنازعات کو اپنے لئے کبھی بوجھ نہیں سمجھا۔ اور اس کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی فطرت پر قائم رہیں۔ اور اپنے لئے اسی راستے کو چنا جس پر وہ چلنا چاہتی تھیں۔ حق گوئی کے اظہار پر انہیں کیا کچھ نہیں سہنا پڑا۔ لیکن اپنے موقف کو چھوڑنا ہرگز گوارہ نہ کیا۔ سماج میں ٹیڑھے پن پر شرافت کا جو لبادہ پڑا ہوا تھا اور جس کی آڑ لے کر مردوں کا سماج اپنی منمانی کر رہا تھا۔ اس سے ان کے دل میں نفرت کا آتش فشاں ابل پڑا۔ اور عصمت نے حقائق گوئی کا تیر ترکش سے نکال لیا۔ عصمت کا یہ ایک ایسا جرأت مندانہ اقدام تھا جس نے ہندوستانی سماج میں بھونچال لا دیا۔ اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر جن حقائق کا برملا اظہار کیا ان کے اس اظہار پر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کے وہ عصمت کے مشاہدات کو غلط ٹھہرا سکتا۔ عصمت کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں ان مسائل اور موضوعات کو جگہ دیں جو بالکل اچھوتے ہوں۔ عصمت نے اپنے ان اچھوتے موضوعات کو جو زبان عطا کی اس نے ان کے ناولوں کے حسن کو دوبالا کر دیا۔ ہم عصر خواتین ناول نگاروں میں اس لحاظ سے ان کو فوقیت حاصل ہے۔ قاری بھی پڑھتے وقت اس سے سرسری نہیں گزر سکتا۔ کیوں کہ زبان کی مٹھاس کی کشش میں وہ خود کو اسیر پاتا تھا۔

عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ۱۹۴۵ میں نیا ادارہ لاہور سے شائع ہوا۔ موضوع کے لحاظ سے اس ناول کو تین حصص میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ سماج سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ انسانی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس کا تیسرا حصہ پس پردہ خود نوشت پر مبنی ہے۔ اس لئے ہم بہ یک وقت اس ناول کو تثلیث کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے قبل کہ میں ٹیڑھی لکیر پر اپنے خیالات کا اظہار کروں اس ناول کے بارے میں عصمت جو رائے رکھتی ہیں۔ اس کا اس لئے پڑھنا ضروری ہے کہ اس سے ناول کے پس منظر پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ وہ

فرماتی ہیں کہ:

''ٹیڑھی لکیر میں نے عام رندگی سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اس کے تمام کردار زندہ ہیں۔ اپنے اور اپنے دوستوں کے خاندان ہیں۔ میں نے سائیکالوجی پر بہت سی کتابیں پڑھیں ان سے میں نے شمن کے کردار کا تجزیہ کرتے وقت مواد ضرور لیا' مگر فرائڈ کے اصول کے بالکل الٹ لکھا ہے۔ فرائڈ کہتا ہے کہ ہمارا ہر فعل جنسی تحریک سے ہوتا ہے۔ مگر میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ جنس اپنی جگہ ہے مگر ماحول کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔''[۲]

عصمت کا یہ ناول سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کی ان گرہوں کو بھی کھولتا ہے جس میں صدیوں سے انسان مجبور محض تھا۔ عصمت نے اسے محسوس کیا اور ''ٹیڑھی لکیر'' کے ذریعہ انسانی نفسیات کو اجاگر کیا 'انسانی نفسیات کو جاننا' 'سمجھنا' پرکھنا اور پھر اس پر عمل پیرا ہونا کس قدر مشکل کام ہے۔ لیکن اس مشکل کام کو عصمت نے کو ٹیڑھی لکیر کے ذریعہ بحسن و خوبی کر دکھایا۔ جو ان کہ مشاہدات اور تجربات پر دال ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کی ہندوستانی معاشرت جس تیزی کے ساتھ اپنے اندر تبدیلی لا رہا تھا اور مصلح قوم مشرقی تہذیب کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔ ایسے متعدد مسائل اور خاص طور لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ اس ناول میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ نئے اقدار کے توسط سے ایسے کئی ادارے قائم ہو چکے تھے جہاں آزادی کے ساتھ لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ لیکن اس تعلیمی آزادی سے معاشرے میں جو بگاڑ شروع ہوا اس سے خود عصمت کو اختلاف تھا۔ اسی بنا پر وہ اپنے تاثرات کوٹ ''یڑھی لکیر'' میں اس طرح پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''آہستہ آہستہ یہ مرض اور پھیلا۔ ہر لڑکی اپنے چچیرے، ممیرے، خلیرے بھائی کا رومانجوڑ جوڑ کر سنانا شروع کیا۔ بلقیس کے عاشقوں کی تعداد کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اس کے بھائی کے دوست جتنے تھے وہ تو رجسٹرڈ عاشق تھے اور بھی جسے پینگ بڑھانی ہوتی وہ بھائی رشید سے دوستی کر لیتا اور اس بہانے مزے سے امیدواروں میں نام ڈال کر روز آن موجود ہوتا۔''[۳]

درحقیقت عصمت چغتائی اپنے اس ناول میں یہ بتانا چاہتی ہیں کہ جس دبستان میں بچیاں تعلیم حاصل کریں اس جگہ پر تقدیس کا ماحول ہونا چاہیے۔ جس سے بچیوں کا مستقبل تابناک بن سکے۔ اور جس کا سیدھا فائدہ سماج تک پہنچے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لڑکیوں کی چھچھوری حرکتوں سے معاشرے میں اخلاقی گراوٹ کا جو امکان ہوتا ہے اسے ختم کیا جا سکے۔ تعلیم حاصل کرتے وقت لڑکیوں کو بھی یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے۔

عصمت کے زمانے کے سماج میں بیوہ خواتین کا بھی مسئلہ ایک اہم مسئلہ کی صورت میں موجود تھا۔ ایک عورت بیوہ ہوتے ہی یہ سمجھ لیتی تھی کہ اب اس دنیا سے اس کا تعلق باقی نہیں رہا۔ اس بنا پر غم کی چادر اوڑھ کو وہ اپنے آپ کو سماجی بندھنوں سے آزاد کر لیتی تھی۔ عصمت کے نزدیک بیوہ عورت کا یہ عمل کسی طور پر بھی مستحسن نہیں تھا۔ عصمت چاہتی تھی کہ بیوہ عورت عملی دنیا میں چاق چوبند رہ کر زندگی گزارے۔ اور دنیا کے سامنے ایسا نمونہ پیش کرے کہ وہ عالم بیوگی میں بھی خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے اپنے اسی پیغام کو بیوہ خواتین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

سماج کی بڑی بوڑھی خواتین کا رویہ عصمت کے زمانے میں بچیوں کے ساتھ اس طرح کا تھا کہ وہ اپنا دبدبہ قائم رکھنے کی غرض سے ہر جوان لڑکی کو ڈانٹ ڈپٹ میں رکھتی تھیں۔اس کو بھی عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں حدف نشانہ بنایا ہے۔کیوں کہ اس سے لڑکیوں کی قوت پرواز تھم جاتی تھی۔اور وہ کمزور پڑ جاتی تھیں۔جسے سماجی نقطہ نظر سے مستحسن نہیں کہا جاسکتا۔اپنا یہی پیغام سماج کی بوڑھی خواتین کے لئے عصمت کا تھا۔

ٹیڑھی لکیر میں عصمت نے کثرت اولاد پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ان کے نزدیک ہر ہندوستانی خواتین کو زیادہ سے زیادہ بچہ پیدا کرنے کے شوق ہوتا ہے۔یہاں پر خود ان کی ذاتی زندگی کی جھلک نظر آجاتی ہے کہ وہ خود دس بھائی بہن تھے۔اولاد کی زیادتی ان کے نزدیک والدین کے لئے ایک بڑا مسئلہ ہوتا تھا۔کیوں کہ کثرت اولاد کی بنا پر جس طرح کی تعلیم وتربیت ان کی ہونی چاہیے ممکن نہیں ہو پاتی تھی۔اور ایک اچھے سماج کی تعمیر وتشکیل میں رکاوٹ کا سبب ہوتی تھی۔اس لئے سماج کے افراد کو اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ٹیڑھی لکیر کے واقعات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اس بات کا اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا کہ اس ناول کے واقعات کا تانا بانا عصمت کی ذاتی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔جیسا کہ اس ضمن میں ڈاکٹر یوسف سر مست لکھتے ہیں کہ:

"۔۔۔۔۔بے شمار باتیں عصمت کی زندگی اور ان کے ناول کی ہروئن کی زندگی سے ملتی ہے"۴

پروفیسر عبدالسلام اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"عصمت نے ٹیڑھی لکیر میں ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی ہے جس کی زندگی میں ٹیڑھی لکیر ہے۔اس کی فکر اور عمل کو کجروی عطا کرنے میں اس کے ماحول کو بڑا دخل حاصل ہے۔۵

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ ناول ہندوستانی متوسط طبقہ کی نقاب کشائی کرتا نظر آتا ہے۔جس میں انسانی زندگی کی اگر ایک طرف تلخیاں نظر آتی ہیں تو دوسری طرف خوشیوں کی بھرپور نمائندگی بھی ملتی ہے۔شمن کا کردار نہ صرف انسان کے نفسیاتی اعمال وافعال کا احاطہ کرتا ہے بلکہ ان مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔اس کی تصدیق رشید موسوی صاحبہ کے اس بیان کے بعد میں اپنے اس مقالے کا اختتام کررہی ہوں۔محترمہ فرماتی ہے کہ:

"عصمت نے "ٹیڑھی لکیر" میں متوسط طبقہ کی لڑکی کو اپنی ہروئن بنا کر اس کے اور خود اس کے طبقہ کے بہت سے مسائل کو نہ صرف پیش کیا ہے بلکہ اس پر تنقیدی نظریں بھی ڈالی ہیں۔"۶

حواشی

۱۔پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار از ڈاکٹر شمیم نکہت ص۸۱۔
۲۔بحوالہ تلاش وتوازن از ڈاکٹر قمر رئیس ۴۴۔
۳۔ٹیڑھی لکیر از عصمت چغتائی ص۹۳۔
۴۔بیسویں صدی میں اردو ناول از ڈاکٹر یوسف سرمست ۴۰۴۔
۵۔اردو ناول بیسویں صدی میں از پروفیسر عبدالسلام ص۳۷۱۔
۶۔"سب رس" بعنوان عصمت کی ٹیڑھی لکیر از رشید موسوی ص۳۴۔

ڈی ڈی اردو راجستھان کے مشاعرے پر ایک نظر

از۔عبدالمنان

ریسرچ اسکالر، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

دوردوشن ہندوستان کا سب سے مقبول ٹی وی چینل ہے۔جو سب سے زیادہ دیکھا بھی جاتا ہے۔مختلف صوبوں کی راجدھانیوں میں اس چینل پر اردو پروگرام بھی بنائے جاتے ہیں۔راجستھان میں یہ چینل ڈی ڈی راجستھان کے نام سے منفعل ہے۔اس کا ایک اردو پروگرام بزم ادب کافی مقبول ہے۔آجکل اس پروگرام کی ذمہ داری ڈی ڈی اردو دہلی کے پروڈیوسر جناب شکیل ارحمٰن صاحب پر ہے۔اس پروگرام میں اردو زبان وادب کے تعلق سے گفتگو کی جاتی ہے۔جب سے شکیل الرحمٰن صاحب نے اس کی ذمہ داری سنبھالی ہے،اس کا معیار بہت بلند ہوا ہے۔"بزم ادب" سے ہٹ کر شکیل صاحب اپنے ٹی وی اسٹیشن میں مشاعرے بھی منعقد کرواتے ہیں۔جن میں مشہور شعراء شرکت کرتے ہیں۔ایسا ہی ایک اہم اور معیاری مشاعرہ ڈی ڈی راجستھان پر ۱۹/مارچ ۲۰۱۷ء کو ٹیلی کاسٹ کیا گیا۔جس میں سات مشہور ومعروف شعراء نے شرکت کی۔زیر نظر مضمون اسی مشاعرے کی ایک روداد یا آنکھوں دیکھا حال ہے۔قارئین کی دلچسپی کے لئے یہ مضمون ہندوستان کے مشہور سہ ماہی رسالہ "اسباق" میں اشاعت کے لئے بھیجا جارہا ہے۔

سب سے پہلے شریک ہونے والے شعرا کے نام ملاحظہ کیجئے۔۱۔جناب نذیر فتح پوری (شیخاواٹی)۔۲۔جناب اظہار مسرت یزدانی (ٹونک)۔۳۔ڈاکٹر محمد حسین (بیکانیر)۔۴۔سرفراز شاکر (اودے پور)۔۵۔عبدالرحیم اختر (جے پور)۔۶۔شاہد احمد جمالی (جے پور)۔۷۔عبداسلام سلام (جے پور)۔مشاعرے کے ناظم ہیں جناب سید معظم علی صاحب (سکریٹری، راجستھان اردو اکیڈمی، جے پور)

معظم علی صاحب نے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے تمام شعراء کا تعارف کرایا۔

"ناظرین آداب مشاعرے کی اس خوبصورت محفل میں، میں آپ تمام حضرات کا تہہ دل سے استقبال کرتا ہوں۔ناظرین آج کا یہ خوبصورت مشاعرہ اس معنی میں اہم ہے کہ شاعری کے بدلتے منظر میں راجستھان ملکی سطح پر اپنی موجودگی کہاں درج کرا رہا ہے، آج کے اس مشاعرے سے آپ کو پتہ چلے گا۔ شاعری کے مختلف پہلو اس مشاعرے کے ذریعہ آپ کے سامنے آئیں گے۔"

سب سے پہلے جنابعبد السلام سلآم کو اس شعر کے ساتھ دعوت سخن دی۔

اپنے دئے کو چاند بتانے کے واسطے
بستی کا ہر چراغ بجھانا پڑا مجھے

جناب سلآم جے پوری صاحب راجستھان کے مشہور ومعروف شاعر اور افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ستار جے پوری کے صاحبزادے ہیں۔آپ کا تعلق مرزا مائل دہلوی اسکول سے ہے۔آپ نے ماہر جلیلی سے تلمذ حاصل کیا، انھوں نے

استاد جلیل سے، انھوں نے استاد شیدا سے، انھوں نے مولانا کوثر سے انھوں نے مرزا مائل دہلوی سے۔ سنئے سلام صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ پہلے ایک مطلع سنایا۔

کرتے ہو بات ہم سے لہجہ میں اجنبی کے
لگتا ہے آ گئے ہوں کہنے میں تم بھی کسی کے

اس کے بعد سلام صاحب نے اپنی غزل شروع کی جس کے تین اشعار یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

کیا مسرور جب دل کو خوشی نے
ہزاروں غم دئے ہیں زندگی نے
بڑی مشکل سے آیا مسکرانا
پڑے ہیں زہر غم کے گھونٹ پینے
بھلا بیٹھا میں اپنے دشمنوں کو
دئے جو زخم تیری دوستی نے

دوسری غزل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

وہ پہلی ملاقات میں ایسے ملے مجھ سے
جیسے کہ میری ان سے شناسائی بہت ہے
دیوانے کو رکنے ہی نہیں دیتا تجسس
دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہرجائی بہت ہے
یہ رات مرے خواب کی تعبیر ہے شاید
اس رات کی آنکھوں میں شناسائی بہت ہے
وہ میری رسائی سے بہت دور ہے لیکن
دل میرا سلام اس کا تمنائی بہت ہے

سلاؔم جے پوری کے بعد اب سید معظم علی صاحب نے اس شعر کے ساتھ شاہد احمد جمالی کو دعوت سخن دی ہے۔

عجب احساس ہے گرد گناہ چھو کر گزر جائے
تو اپنے آپ کو ہم دیر تک میلے سے لگتے ہیں

جناب شاہد جمالی صاحب کا نام آج راجستھان کی حدود سے نکل کر ملکی سطح پر اپنی پہچان بنانے لگا ہے۔ پچھلے چند برسوں میں آپ نے بڑی شدت سے اردو ادب میں ایک محقق کی پہچان بنائی ہے۔ آپکی درجنوں تحقیقی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہے۔ آپ جے پور کی مشہور و معروف ادبی شخصیت جناب رضی الدین رضا بے پر کے خاص بھتیجے اور حافظ منظور احمد ادیب کے صاحبزادے ہیں۔ گویا شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ کلام ملاحظہ کریں۔ پہلے ایک قطعہ۔

ذرے سے جس کی خاک کے روشن ہوئی میری جبیں
شاہد عقیدہ ہے مرا جینا یہیں مرنا یہیں

جنت نشاں ہے بے گماں میرا وطن ہندوستاں
سرچشمہ علم و ادب میرے وطن کی سر زمیں

اس کے بعد شاہد جمالی اپنی غزل شروع کر رہے ہیں۔ تین شعر ملاحظہ ہوں۔

لے گئے ہیں ساتھ اپنے علم و فن زیر زمیں
میر و ذوق و غالب شیریں سخن زیر زمیں
صاف ستھرے جن کے تھے اعمال نامے دہر میں
ان کے ہوتے ہی نہیں میلے کفن زیر زمیں
تو نے شاہد دار فانی میں کئے تھے نیک کام
حشر تک گلشن بنا تیرا وطن زیر زمیں

شاہد جمالی صاحب کے بعد، معظم صاحب نے سرفراز شاکر صاحب (جودھپوری) کو دعوت سخن دی ہے۔ شاکر صاحب فرما رہے ہیں۔

عجب رخ اور غضب رستے پہ ہوں میں
حیات و موت کے خیمے پہ ہوں میں
خضر وادی کہاں سبزے پہ ہوں میں
بجھی کائی کے سرچشمہ پہ ہوں میں

شاکر صاحب کے بعد اب جناب عبدالرحیم اختؔر کو دعوت سخن دی جا رہی ہے۔ اختؔر صاحب کا تعلق غالبؔ اسکول سے ہے۔ آپ، داروغہ منصور علی خاں بسمؔل کے شاگرد ہیں، جو شاگرد تھے حضرت آگاہ دہلوی کے اور وہ شاگرد تھے مرزا غالب کے۔ اختر صاحب روایتی شاعری کے پاسدار اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کا کلام دیکھئے۔

میسر جان الفت کی رفاقت ہو تو نیند آئے
کسی صورت اگر تکمیل چاہت ہو تو نیند آئے
کرم گستر توجہ دے تو ہو تسکین کا ساماں
دل غمگین پر اس کی عنایت ہو تو نیند آئے
ہجوم غم میں گھر کر کوئی انساں کس طرح سوئے
خوشی ہو شادمانی ہو مسرت ہو تو نیند آئے
نہ ہو منشائے رب اختؔر تو کوئی سو نہیں سکتا
خدا کی مہربانی ہو عنایت ہو تو نیند آئے

اختؔر صاحب کے بعد اب معظم صاحب دعوت سخن دے رہے ہیں جناب اظہار مسرت صاحب کو۔ اظہار صاحب ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جدید تقاضوں اور نئے مضامین کی بندش آپ کی شاعری کی خصوصیات

ہیں۔غزل، نظم، دوہا، قطعہ، مخمس، مسدس، اور تضمین وغیرہ میں آپ نے بہت طبع آزمائی کی ہے۔ بہت جو شیلے انداز میں پڑھتے ہیں، آپ بھی ملاحظہ کیجئے اور کلام کی داد دیجئے۔

سر گراں ہے فکر میری بے خبر میری غزل
بھیڑ میں گم میرا ماضی میرا گھر میری غزل
جانی پہچانی ہوئی بستی بھی کچھ کچھ اجنبی
ہے شکستہ دل سراسیمہ نظر میری غزل
ہر ساعت ہے سوالی ہر تکلم ہے خموش
ہے فضاؤں میں منقش مشتہر میری غزل

ایک اور غزل کے اشعار ملاحظہ کریں۔

الجھنیں گھر میں بڑھیں رختِ سفر اچھا لگا
کھل کھلا کر ہنس پڑے بچے تو گھر اچھا لگا
تم معزز ہو گئے مجھ کو ملیں رسوائیاں
شیشۂ احساس چٹخا تو، مگر اچھا لگا
بولتے چہرے کو کر دیتا ہے تصویرِ خموش
مردہ آئینہ کا یہ زندہ ہنر اچھا لگا

اظہار مسرت صاحب کے بعد معظم علی صاحب جناب ڈاکٹر محمد حسین صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ڈاکٹر محمد حسین، ڈونگر کالج، بیکانیر کے شعبہ اردو کے صدر ہیں۔آپ ایک بڑے محقق ہیں اور کئی کتب منظر عام پر آچکی ہیں۔جدید لب ولہجہ اور بڑے نازک سے خیالات ہیں۔پانی کی زمین میں ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مو لا تیری رحمت ہے تیری ہے عطا پانی
ایسا بھی نہ ہو لیکن بن جائے سزا پانی
ایوان محبت کے آداب ہیں جدا گانہ
ہونٹوں کی زباں خشکی آنکھوں کی صدا پانی
ہیں آگ ہوا پانی ہستی کے عناصر بھی
اور موت کے ساماں بھی ہیں آگ ہوا پانی
آلودہ نہ ہو جائے نظروں کی کثافت سے
کورا یہ تیرا برتن ،تازہ یہ ترا پانی

اب آخر میں سب سے اہم اور ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر جناب نذیر فتح پوری صاحب کو، معظم صاحب دعوت سخن دے رہے ہیں۔اردو دنیا میں نذیر فتح پوری صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔آپ کم وبیش ۸۰ رکتابوں کے خالق ہیں۔بے شمار شعری مجموعے ہیں۔صحافت میں بھی آپ کا بڑا نام ہے۔سنہ ۸۰ ر سے سہ ماہی

اسباق، پونہ سے نکال رہے ہیں۔آپ نے شاعری کی بیشتر صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔بین الاقوامی شہرت اور شخصیت کے مالک ہیں۔فتح پور شیخاواٹی آپ کا جائے پیدائش ہے۔کلام سنئے اور کیف وسرور حاصل کیجئے۔نذیر صاحب کے ہی ایک دوہے کے ساتھ معظم صاحب نے ان سے فرمائش کی ہے۔

گوری بیٹھی سیج پر رہ رہ آئے دھیان
ساجن آئے تب ملے املی کا پکوان

اب نذیر صاحب نے مختلف اشعار اور دوہوں کے ساتھ اپنا کلام سنانا شروع کیا ہے۔

روشنی کی لکیر باقی ہے
میر ہے تو نذیر باقی ہے
تو اپنی چترائی کو سمجھا ہے انمول
میری مٹھی لاکھ کی کھول سکے تو کھول
خشکی میں بھی پائے گا تو پانی تتکال
سچ کی رسی باندھ کر ڈول کنوئیں میں ڈال
طلسم دہر کے پردے ٹٹولتا کیسے
میں آدمی تھا تیرے راز کھولتا کیسے
ہاتھ اور چہرے میں کیا تضاد آیا ہے
آئینے بناتا ہوں دیکھنے سے ڈرتا ہوں
فکر دل باقی رہے چشم ہنر باقی رہے
مجھ میں جو موجود ہے وہ دیدہ ور باقی رہے
آنکھ تو بے رنگ منظر میں الجھ کر رہ گئی
ذہن میں تو کم سے کم تتلی کا پر باقی رہے
کج کلاہی کی حفاظت تو ضروری ہے مگر
یہ دعا بھی کرتے رہنا ہے کہ سر باقی رہے
خواہش پرواز تو باقی ہے دل میں آج بھی
ہاں مگر اڑنے تلک تو بال و پر باقی رہے
اے نذیر احمد دعائیں کرتے رہئے رات دن
زخم کے بھرنے تلک تو چارہ گر باقی رہے

قارئین، یہ تھا ڈی ڈی راجستھان (جے پور) پر منعقدہ ایک مشاعرہ۔جس کی روداد آپ نے پڑھی۔کیسا لگا۔اپنے خیالات کا اظہار ''اسباق'' میں ضرور کیجئے۔نیاز مند۔عبدالمنان۔

حکومت ہند کی جانب سے اردو زبان کی فلاح و بہبود کے لئے لاتعداد انجمنیں کارفرماں ہیں جوگنگا جمنی

تہذیب کی علامت اس اردو زبان کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں۔مثلاً UGC' NCPUL کے پروجیکٹ' اور اسی طرح کے دیگر شعبے اردو زبان وادب کی فلاح کے لئے کام کر رہے ہیں جن میں ایک شعبہ ڈی ڈی اردو بھی ہے جو اس شریں زبان کو ہر عام وخاص کے دلوں تک پہچانے کا کام کر رہا ہے اور بڑے انہاک کے ساتھ اردو زبان کی فروغ کے لئے کوشاں ہے۔ڈی ڈی اردو اور اردو زبان سے متعلق مختلف نوعیت کے پروگرام منعقد کرتا ہے مثلاً تنقیدی نظریے، تحقیقی بصیرت، بحث ومباحثہ، محفل تصوف، محفل حمد ونعت، محفل سلام ومنقبت، محفل مشاعرہ وغیرہ اہم۔

اس وقت ڈی ڈی راجستھان میں شعبہ اردو کی ذمہ داری جناب شکیل الرحمٰن کے سپرد ہے۔جن کے جے پور آنے کے بعد اردو کے پروگرامز کا معیار کافی بلند ہوا ہے جو ہمارے صوبے کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔

میرا یہ مضمون خاص طور پر ڈی ڈی اردو راجستھان پر ہوئے ایک مشاعرے کے تعلق سے ہے۔جس میں راجستھان گیر کے نامور شعراء کرام نے شرکت کی تھی۔جس میں ڈاکٹر اظہار مسرت، سرفراز شاکر، شاہد احمد جمالی، عبدالسلام عبدالرحیم خان اختر، ڈاکٹر محمد حسین اور عالم گیر شہرت رکھنے والے جناب نیاز فتح پوری نے شرکت کی جو اردو زبان کی فلاح و بہبود کے لئے ہر دم کوشاں رہتے ہیں اور ایک طویل عرصے سے اسباق کے نام سے جریدہ نکال رہے ہیں۔اس مشاعرے کو جب میں نے دیکھا اور سنا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ دہلی اور لکھنؤ اپنی جگہ ہیں لیکن راجستھان میں بھی اردو شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے والے ابھی ناپید نہیں ہوئے ہیں۔اس مشاعرے سے یہ اندازا لگایا جاسکتا ہے کہ صوبہ راجستھان میں شعروادب کی جڑیں کافی مضبوط ہیں۔جس کی نظیر میں مشاعرے میں موجود شعراء کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں ملاحظہ ہوں:

اس امتحاں سے بھی اکثر گزرنا پڑتا ہے
بلندیوں پہ پہنچ کر اترنا پڑتا ہے

(اظہار مسرت)

نہ چھت کے خواب نہ آنگن میں خواہشوں کے گلاب
غریب بچے بلا کے ذہین ہوتے ہیں

(اظہار مسرت)

دیکھیں اس دور میں حق گوئی کا ہے کیا انعام
چھیتڑے جسم کے اڑتے ہیں کہ سر کٹتا ہے

(اظہار مسرت)

جن دنوں صحن چمن نذر خزاں ہوتا ہے
نہ کسی گل کا نہ غنچے کا نشاں ہوتا ہے

(عبدالرحیم خاں اختر)

میں رہبر ہوں نہیں بیٹھوں گا ہر گز فکر جاں لے کر
مجھے چلتے ہی رہنا ہے ہمیشہ کارواں لے کر

(عبدالرحیم خاں اختر)

جب اسے حد سے زیادہ ملتفت پاتا ہوں میں
ناز اس تقدیر پر کرتا ہوں اتراتا ہوں میں

(عبدالرحیم خاں اختر)

اس مشاعرے میں سبھی شعراء نے سنجیدہ کلام پیش کیا اور اردو شاعری سے شغف رکھنے والے حضرات کا ذہن اپنی جانب مبذول کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی کہ اختر شیرانی اور مخمور سعیدی کی میراث کو ہم نے پوری ذمہ داری کے ساتھ سنبھالے ہوا ہے۔یہ مشاعرہ اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے صوبے میں اردو شعروادب کا مستقبل تابناک ہیں۔اور اردو زبان کے محافظ آج بھی اپنی اس سرزمین میں موجود ہیں۔ڈی ڈی راجستھان کا میں دل سے شکر گزار ہوں کہ وہ اس پیاری اور گنگا جمنی زبان کے فروغ میں پورے انہاک کے ساتھ کام کر رہا ہے۔میں اس کے لئے ڈی ڈی راجستھان کے ڈائریکٹر جناب رمیش سنگھ جی کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

☆☆☆

مکتوبی ادب کی اشاعت کی جانب ایک اہم قدم
سہیل عظیم آبادی بنام مناظر عاشق ہرگانوی
شائع ہو چکی ہے۔
صفحات ۱۲۸/مجلد کتاب۔قیمت ۱۵۰/روپے
رابطہ
پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی۔موبائل نمبر 09430966156

تبصرہ

نام کتاب:۔ **چھوٹا بچہ چھوٹی کتاب**، مصنف:۔ ڈاکٹر نذیر فتح پوری، صفحات:۔۷۲
مبصر۔ ایم، مبین

ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف ایک اچھے شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، ناقد اور محقق کے ساتھ ادب اطفال میں بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ''چھاٹا بچہ چھوٹی کتاب'' ان کی بچوں کے لیے لکھی ۱۷ خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ ہے اس سے قبل بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کے دو مجموعہ ''میرا دیش مہان'' اور'' پیشاور کی ۱۷ کہانیاں'' بھی شائع ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں شامل تمام ۱۷ کہانیوں میں نذیر فتح پوری صاحب نے بچوں کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ آج کے زمانے میں، بچے، ان کو درپیش مسائل، ان کے ماں باپ کے مسائل، ان کی خواہشات اور امکانات کی تکمیل میں پیش آنے والے مسائل وغیرہ جیسی باتوں کو نذیر صاحب نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔

نذیر صاحب کے پاس ایک حساس دل ہے اور وہ جہاں کوئی غلط بات دیکھتے ہیں یا کوئی ایسی بات جو زمانہ دین، دانش کے خلاف ہوتی ہے وہ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنے قلم کا سہارا لیتے ہیں اور اپنے احساسات، جذبات اور احتجاج کو خوبصورت کہانیوں کی شکل میں ڈھال دیتے ہیں۔

اس مجموعے کی زیادہ تر کہانیاں اسی جذبے کے تحت لکھی گئی ہیں۔ ابتدائی چند کہانیاں کتاب کے موضوع پر ہیں۔ چھوٹا بچہ چھوٹی کتاب، کتابوں کا بوجھ، وہ ایک کتاب، اور لالچی ادیب وغیرہ۔

ان کہانیوں میں نذیر صاحب نے جو واقعات پیش کئے ہیں وہ حقیقت کے کافی قریب ہیں یا یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے حقیقتوں کو ہی کہانیوں میں ڈھال دیا ہے اور بڑی خوبصورتی سے انھوں نے بچوں اور قارئین تک اپنے دل کی بات پہونچا کر اپنا حق ادا کیا ہے۔

یہ بات تو درست ہے کہ چھوٹی عمر کے بچے چھوٹی کتابیں اور کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کی عمر اور مطالعہ بڑھتا جاتا ہے ان کی دل چسپی چھوٹی کہانیوں اور کتابوں میں کم ہو کر بڑی کتابوں اور کہانیوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ اور یہ اہم نقطہ نذیر صاحب نے بچوں کے لیے اور بچوں کے لیے لکھنے والوں کے لیے زیادہ نصیحت کے طور پر اس کہانی میں پیش کیا ہے۔

'کتابوں کا بوجھ' میں انھوں نے ایک بڑے سنگین مسئلے کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ اور پہلی بار شائد اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ بچوں پر کتابوں کے بڑھتے بوجھ کے ایسے سنگین نتائج بھی برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے اب سنجیدگی سے اس پر غور کر کے کوئی حل نکالا جائے ورنہ ممکن ہے آنے والی نسل میں ہمیں کئی امجد جیسے بچوں کا سامنا کرنا پڑے۔

''بے وقوف مکلو'' ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس کہانی میں نذیر صاحب نے صرف مکلو کی دلچسپ باتوں اور دلچسپ واقعات کو پیش کیا ہے۔

'' موبائل کی کہانی'' اور لالچی ادیب'' اس کے بارے نذیر صاحب نے خود اعتراف کیا کہ یہ سچے واقعات پر مبنی ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں کوئی تبصرہ کرنا مناسب نہیں ہے۔

غرض یہ ایک دلچسپ کتاب ہے جسے رحمانی پبلی کیشن مالیگاؤں سے ۵۰ روپئے میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مکتوبات

شاہ حسین نہری...اورنگ آباد

برادرم نذیر فتح پوری صاحب۔۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''اسباق'' کا جنوری، فروری، مارچ ۲۰۱۷ء کا شمارہ ملا، شکریہ۔ آپ کے اداریہ سے آپ کے قلبی دکھ کا اندازہ ہوا۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ دیکھئے زمانہ اور کیا کیا دکھاتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور عافیت کے ساتھ اپنے حفظ وامان میں رکھے اور دین وادب اردو کی مثبت خدمت کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

''اُردو بک ریویو'' نے یہ رنج دہ اطلاع دی کہ ادارۃ الحسنات سے متعلقہ رسائل بند ہو رہے ہیں اور آپ نے ''اسباق'' سے متعلق اسی خدشے کا اظہار کیا ہے۔ ''اسباق'' اردو کا ایک رسالہ ہے اس کا بند ہونا ایک دکھ کی بات ہے

خواہرم حمیدہ معین رضوی صاحبہ کا گوشہ (حالاں کہ ''گوشہ'' کا لفظ ان معنوں میں مجھے عجیب سا لگتا ہے) آپ نے خوب شائع کیا ہے۔ ان کی اولاد کا بھی تعارف شامل ہوتا تو اچھا تھا۔

برادرم حقانی القاسمی صاحب کا مضمون خوب ہے بلکہ درحقیقت انٹرویو۔ حمیدہ صاحبہ کا یہ جملہ مزا دے گیا ''مجھے آزادیٔ نسواں کے لفظ سے چڑھ ہے اسلام نے ۱۴۰۰ سال پہلے جو حقوق دیئے تھے وہ تاریخ کی بہت بڑی آزادی کا اعلامیہ تھا'' دیگر مشمولات بھی کارآمد ہیں۔ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ آپ نے بھی موصوفہ سے معلومات افزا سوالات کئے ہیں اور انھوں نے بھی بے تکلف اور صاف صاف جوابات دیئے ہیں پھر بھی مردوں کی بالادستی والے سماج اور عورتوں کی پسماندگی سے متعلق ان کے بعض خیالات کچھ الجھاوے میں ڈالنے والے محسوس ہوئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ وہ قرآن حکیم ومجید کو صحیفۂ ہدایت سمجھتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ عورتوں کو ان کے حقوق مناسب طور پر ضرور ملیں۔

قرۃ العین حیدر پر ان کا مضمون خیال افروز اور فکر انگیز ہے۔ میں نے حمیدہ صاحبہ کو بھی اسی میل کے ذریعہ اطلاع دی ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ ادب تخلیق کرنے والوں سے بعض لوگ عجیب مطالبے کرتے ہیں جیسے قرۃ العین حیدر سے یہ کہنا کہ آپ کے فلاں فلاں کردار کیوں نہیں ہیں اور آپ نے فلاں ماحول کی عکاسی کیوں نہیں کی ہے۔

جنید عبدالقیوم شیخ سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ برادرم شمیم احمد صدیقی نے ان کے بارے میں اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور اچھی توقعات باندھی ہیں۔ میں ان کی دعا پر آمین کہتا ہوں۔

برادرم رونق افروز صاحب ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ ڈاکٹر محمود حسن الٰہ آبادی کے بارے میں مضامین لکھ رہے ہیں۔ ☆☆☆

شارق عدیل...ایٹا۔ یوپی

مکرمی! محترمی!.....................نذیر فتح پوری صاحب.....................سلام واکرام

جس روز آپ سے فون پر بات ہوئی تھی، اس کے دوسرے دن ''اسباق'' مارچ ۲۰۱۷ء کا شمارہ مل گیا

تھا۔ یہاں وہاں سے دیکھا پرچہ کی ادبی اہمیت کا اندازہ ہوا۔محترمہ حمیدہ معین رضوی صاحبہ کی بلند شعری وادبی قامت سے بیشتر اُردو والے واقف ہیں اوران کی قدر کرتے ہیں۔ کیوں کہ ان کے مزاج میں بسی ہوئی مشرقی طہارت ان کی تخلیقی کھڑکیوں سے مسلسل جھانکتی رہتی ہے۔ جواس دور کے تازہ کارتخلیقی ذہنوں کے لئے ایک سبق کے مترادف ہے کیوں کہ اس وقت اخلاقی قدریں اپنی پامالی پرآنسو بہانے سے بھی خوف کھاتی ہیں۔محترمہ سے ''حقانی القاسمی کالیا ہواانٹرویواس شمارے کی بہت ہی کامیاب اورضروری تحریر ہے۔اورممکن ہے خواتین اس کو پڑھ کراپنی موجودہ صورتحال پرایک بارپھرغورکرنے کی زحمت کوگوارہ فرمالیں اورزندگی میں مرد سے تیز دوڑنے کی ضدکو نظرانداز کردیں اوراپنے تخلیقی مقصد پرغورکریں کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسامردنہیں ہے جوعورت کے بغیراس زمیں کے لمس سے آشنا ہواہواورنہ ہی کوئی ایسامرد ہے جس کی شخصیت عورت کے احسانوں کے بغیرمکمل ہوئی ہوکیوں کہ خالق کائنات نے عورت کوزمین پر برکت کی صورت میں اتارا ہے اس لئے اسے پوری طرح محسوس کرنے کی ضرورت ہے بقول محترمہ حمیدہ معین رضوی کے مرد، باپ، بیٹا، بھائی بھی ہے۔اسی طرح عورت بھی ماں، بیٹی، بہن بھی ہے۔انسان خدائے لم یزل کے بنائے ہوئے قانون سے چاہے جس قدرانحراف کرلےمگر مذکورہ رشتوں کی بنیاد سے فراراختیارنہیں کرسکتا۔اس لئے مردوعورت کی تقسیم کی جنگ انا کا ایک ایسافریب ہے جودونوں کوصدیوں سے برباد کررہاہے۔

محترم جنید عبدالقیوم شیخ، کے گوشے میں بھی پڑھنے کے لئے بہت کچھ ہے کیوں کہ یہ دورسائنس کی انگلی پکڑ کرچلنے والوں کا ہے۔اس کودیکھتے ہوئے جوموصوف نے اپنی قوم کے ماضی پر روشنی ڈالتے ہوئے مستقبل کی طرف توجہ دلائی ہے وہ قابلِ قدر ہے۔آپ ابھی تک زندہ ہیں یہ مشتہرکرنے کی کیاضرورت ہے؟ یہ کام تو آپ کی تحریریں کبھی آپ بیتی کے نام سے کبھی خواب بیتی کے نام سے کرتی رہتی ہیں۔''اسباق'' بھلے ہی دیر سے آئے لیکن آپ کاتحریری سلسلہ اردو دنیا میں چلتا ہی رہتا ہے اور ردِعمل کی صورت میں آپ کے تذکروں کوتازہ رکھتا ہے۔رفیق جعفر صاحب نے مقصود الٰہی شیخ صاحب کی ''پوپ کہانیاں'' پرتبصرہ کرتے ہوئے ایک پوپ کہانی کومسترد کردیا، بیٹا۔آپ 'گے' ہیں۔باپ۔وہ کیا ہوتا ہے؟لونڈے باز، منڈے باز'' واقعی اخلاقی معیار مسلسل پستی کی طرف بڑھ رہاہے جس کا احساس رفیق جعفر نے بہت ہی شائستگی کے ساتھ دلایا ہے۔بقیہ چیزیں بھی آپ کی ادارت کونمایاں کرتی ہیں۔☆☆☆

شاہد پٹھان.. جے پور، راجستھان۔

''اسباق'' جنوری تامارچ ۲۰۱۷ءکا تازہ شمارہ پہنچا۔دنیا کے مختلف حصوں میں سرگرم کارادبا اورشعراءکو آپ شروع سے ہی متعارف کراتے رہے ہیں۔یہ سلسلہ دوسرے رسائل بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تخلیقی ادب کے تعلق سے نئے نئے نام اوران کے کاموں سے آگہی ہوتی رہتی ہے۔کچھ لوگوں نے افواہ پھیلارکھی ہے کہ ادب مَررہاہے۔تخلیق بانجھ ہوتی جارہی ہے، نئے لوگ سامنے نہیں آرہے ہیں۔۔۔۔وغیرہ ۔۔۔۔وغیرہ۔میرے خیال سے اس غلط فہمی کودورکرنے میں آپ ایسے مدیران کی خدمات مستحسن ہیں۔

ادار یہ میں آپ نے اپنی اوراسباق کی صحت وحیات کودرپیش آزمائشوں اورکٹھنائیوں کا ذکر کیا ہے۔یہ

سچ ہے کہ قدرت جس سے کام لینا چاہتی ہے بہرحال لے لیتی ہے، دنیا میں بڑے کارنامے انجام دینے والے لوگ ہمیشہ غریب، پریشان اور بدحال ہی رہے اور پیسے والے کبھی بڑے کام نہیں کرپائے اس لئے اقبال کی بات یادرکھنے کے لائق ہے کہ ؎

مراطریق امیری نہیں فقیری ہے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

آپ نے واقعی غریبی میں نام پیدا کرلیا ہے اس بات کا اعتراف آپ کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔آپ نے اداریہ میں کچھ منفی سوچ کے لوگوں کا ذکر کیا ہے، ایسے لوگ تو ہرگاؤں، شہراورشعبہ جات میں سرگرم ہیں۔میں ایسے کچھ لوگوں (راجستھان سے متعلق) کاذکرآپ سے کبھی کبھارکرتا رہاہوں۔پھرایک باردہرادوں کہ ''میرے حاسدوں اور بدخواہوں میں میرے خاص احباب کے ساتھ ساتھ میرے استاذہ بھی شامل ہیں ان میں کچھ مرحوم ہوچکے ہیں ....ان لوگوں نے مجھے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا مگر میں نے صبر کیا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور اس لئے انتقام نہیں لیا کہ کسی بھی مسلمان کوجانی ومالی نقصان پہنچانا ازروئے شرع گناہِ عظیم ہے لیکن نذیر صاحب ! آپ اورہم اللہ سے ڈرتے ہیں مگر منافقین ان باتوں کی ذرابھی پرواہ نہیں کرتے ان کا علاج صرف اللہ کے پاس ہے اس لئے آپ اپنا کام کرتے رہیں، وقت اور قدرت کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتے، غالب کے مقابلے میں ذوق کی شہرت وعزت اصلاًاتفاق وعارضی تھی دائمی عظمت غالب ہی کا مقدرتھی۔

مجھے یہ جان کرخوشی ہوئی کہ آپ پرکوئٹہ یونیورسٹی کے کالج (گورنمنٹ کالج کوئٹہ) میں ڈاکٹرحسن آراء صاحبہ کی نگرانی میں P.H.D کا مقالہ لکھا گیا اوراس پر ڈگری ایوارڈ ہوئی۔ان دنوں میں بھی کوئٹہ ہی میں تھا مگر دوایوا کے ایک روز بعد مجھے علم ہوا۔میں نے بھی کوئٹہ کالج ہی سے B.A(اول پوزیشن کے ساتھ) کیا تھا، برسوں بعد وہاں گیا تو کافی بدلا ہوا محسوس کیا پہلے سے بہتر، بہرحال یہ تحقیقی کام آپ سے کچھ توجہ چاہے گا کہ اسے شائع ہونا چاہئے اورآپ کوتھوڑا وقت اس کے لئے نکالنا ہوگا۔ریسرچ اسکالراورنگرانِ کارکوجوکرنا تھا وہ کرچکے اب آپ کا کام ہے۔۔۔۔آپ نے کتنے ہی لوگوں (اچھے، بُرے) کی کتب اپنے ادارے سے شائع کی ہیں اس کتاب کی اشاعت بھی اسباق پبلی کیشن سے ہوتو کیا حرج ہے۔تخلیق کار کی زندگی میں اس پرتحقیق ہوجانا یقیناً باعثِ مسرت ہے۔مبارک ہو۔آپ تو ماشاءاللہ کافی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔آج کل تو تذکرہ نگاروں، مولفوں اورتیسرے درجے کی مخلوق یعنی محققوں پربھی P.H.D کا کام بے باکانہ طور پرانجام دیا جارہاہے۔چوتھے درجے کی مخلوق یعنی صحافی حضرات بھی اس دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ ان کے رسالے پربھی ایم، فل یاP.H.D کا کام ہوجائے یہ غریب بھی اتنی اُردو جانتے ہیں جتنی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کوآتی ہے حالاں کہ یہ سچ ہے کہ کئی صحافی واقعی پڑھے لکھے ہیں اورکئی اساتذہ سے زیادہ مطالعہ رکھتے ہیں۔

آپ نے اپنی طبیعت کی ناسازی کے بارے میں بتایا، افسوس ہوا، اللہ آپ کوصحت مندرکھے اوربُری نظروالوں سے بچائے، آپ یہ بات تومانتے ہی ہوں گے کہ ہماری صلاحیتوں اورکاموں پرلوگوں کی نظربھی لگتی ہے۔پہلے ان باتوں پریقین نہیں کرتا تھا مگر پھرمیرے مشاہدے میں کچھ معاملات ایسے آئے.........توجناب مجھے لگتا ہے آپ کوبھی نااہلوں اوربدنہادوں کی نظرلگتی رہی ہے۔آئندہ بھی ساودھان رہیں شاید مومن کا مصرع ہے کہ ؎ تجھ

کو اپنی نظر نہ ہو جائے۔

بات ذرا طویل ہو گئی، میں ویسے رسائل کو خط نہیں لکھتا ہوں آج کئی برسوں بعد نہ جانے کیسے دورہ پڑ گیا۔

☆☆☆

شبیر فراز فتح پوری.................................فتح پور شیخاواٹی

تاخیر ہی سے سہی۔ اسباق کے دیدار تو ہوئے۔ کسی ادبی رسالے کی اشاعتی زندگی میں ۳۶ رسال کم نہیں ہوتے، میں دیکھ چکا ہوں آپ تنہا ہی سارا کام انجام دیتے ہیں نہ کوئی ساتھی نہ مددگار اور پھر زرِ کثیر کی فراہمی جو ناممکن کام ہے۔ حالات اور صحت کے ساتھ ساتھ عمر بھی اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس صداقت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم وہ لوگ ہیں جو ساری سچائیوں کو ساتھ لے کر جیتے ہیں، قدرت اور قسمت کے ہم قائل ہیں، یہ ہمارے ایمان کی دلیل بھی ہے۔ تازہ شمارے میں محترمہ حمیدہ معین رضوی کے ساتھ قیوم جنید شیخ کا گوشہ ایک نئی راہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حمیدہ معین رضوی کے جوابات واقعی چونکاتے ہیں اور ذہنی بیداری کا ثبوت دیتے ہیں۔ آپ کے عمان کا سفر آخری منزل کی طرف گامزن ہے، ایک معلوماتی سلسلہ بصورتِ سفر نامہ آپ نے پیش کیا اس کے لئے مبارک باد۔ رفیق جعفر کے تبصرے ہمیشہ کی طرح بے لاگ ہیں۔ ☆☆☆

بدر محمدی.................................ویشالی بہار

مکرمی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اسباق کا شمارہ برائے جنوری تا مارچ ۲۰۱۷ء ملا۔

''ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا'' کے ساتھ موصول ہوا۔ سہ ماہی اسباق اب تک اپنی زندگی کی چھتیس بہاریں دیکھ چکا ہے اور مدیر اسباق جناب نذیر فتح پوری کی عمر اس سے دوگنی ہونے پر آ گئی ہے۔ انھوں نے اپنی آدھی عمر اسباق کی نذر کر دی ہے اور اردو زبان وادب کے لئے پوری نہیں تو آدھی سے زیادہ۔ ایسا انھوں نے زبان وادب کو زندہ رکھنے میں تعاون کے لئے کیا ہے کہ زبان وادب کے زندہ رہنے سے تہذیب زندہ رہتی ہے ضمیر زندہ رہتا ہے وہ ایسی صورت نکالی جانے کے حق میں ہیں جس سے کتاب کا قاری زندہ رہے۔ بہر کیف اسباق کا تازہ شمارہ تازگی سے مملو ہے اور اس میں اپنے قاری کو تازہ دم رکھنے کی پوری قوت ہے اس سے ادب کے بیماروں کی تجدیدِ صحت ہوئی ہے۔ حمیدہ معین رضوی اور جنید عبدالقیوم سے منسوب گوشہ کاروباری نہیں بلکہ معیاری ہیں ان کے تعلق سے جو تحریریں ہیں وہ معلومات افزا ہیں۔ پروفیسر غازی علم الدین کا مضمون ''صد شعرِ غالب کے تفردات'' پُر مغز اور دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ فکشن اور شاعری دونوں حصے کے مشمولات دامن کشِ دل ہیں۔ حالیہ شمارے میں شامل مکتوبات اور ادبی خبر نامہ پیغام رسانی پر کارفرما ہیں اور اس کی سب سے اہم خبر جس پر رسالہ کا اختتام ہوتا ہے یہ ہے کہ محترمہ ترنم نے ڈاکٹر حسن آراء بیگم کے زیرِ نگرانی کوٹہ یونیورسٹی راجستھان سے نذیر فتح پوری پر تحقیقی کام مکمل کر لیا ہے اور انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شجرِ اسباق کے شاخ در شاخ نذیر فتح پوری یا پھر ان کے ذکرِ خیر کا برگ وثمر بھی ہے۔

☆☆☆